حالی

صالحہ عابد حسین

حالی

صالحہ عابد حسین

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 1983
تیسری طباعت : 2016
تعداد : 1100
قیمت : -/20 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 291

Hali

By: Sualeha Abid Husain

ISBN :978-93-5160-114-2

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار ضیا محل، جامع مسجد، دہلی۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے برے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کرسکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائریکٹر

فہرست

پانی پت ـــ حالی کا وطن	7
حالی کا بچپن	9
حالی کا بیاہ اور دلّی کا سفر	11
غدر	17
حالی پھر پانی پت سے باہر نکلے	21
حالی اور سر سیدؔ	27
مسدّس حالی	30
حیدر آباد سے وظیفہ	36
حالی پانی پت میں	39
حالی ـ بچے ـ عورتیں	48

حالی کی سیرت	53
وطن کی محبّت	60
حالی کا مذہب	62
حالی کی کتابیں	63
آخری زمانہ	66

پانی پت ـــ حالی کا وطن

پانی پت دلّی سے کوئی پچاس میل دور بہت پرانی بستی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کی تین بڑی لڑائیاں یہاں لڑی گئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بستی کئی ہزار سال پرانی ہے جہاں کورو اور پانڈو کی جنگ بھی ہوئی تھی۔

کوئی سات سو برس پہلے ملک ہرات سے ایک عالم فاضل بزرگ خواجہ ملک علی اپنا دیس چھوڑ کر ہندوستان چلے آئے تھے۔ اس زمانے میں یہاں غیاث الدین بلبن کی حکومت تھی۔ بادشاہ خواجہ ملک علی کے علم اور فضل سے متاثر ہوا اور ان کی بڑی قدر اور عزت کی اور ان کو قصبہ پانی پت کی زمین اور جائیداد پیش کی۔ ۱۲۷۱ء کا ذکر ہے جب خواجہ ملک علی پانی پت میں آباد ہوئے۔ اس بستی کی ایک خاص بات یہ تھی کہ یہاں ہر زمانے میں بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ پیدا ہوئے۔ بڑے صوفی اور درویش جو خدا سے لَو لگائے رکھتے ہیں وہ بھی یہاں کئی گزرے ہیں ان میں ایک مشہور صوفی بزرگ بو علی شاہ قلندر جو کئی سو برس پہلے یہاں ہوئے تھے۔ ان کا مزار یہاں ہے جس کی زیارت کو دور دور سے لوگ آتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں۔ عید کے مہینے میں یہاں ان کا عرس بھی ہوتا ہے۔

تو ان عالموں اور صوفیوں سے اس بستی کا نام مشہور ہوا۔ مگر سب

سے زیادہ شہرت پانی پت کو ملی حالؔی سے !

خواجہ ملک علی پانی پت میں آباد ہوئے تو ان کی اولاد یہاں خوب پھلی پھولی۔ ان کے خاندان میں سپاہی لوگ بھی پیدا ہوئے جنھوں نے ملک کی حفاظت کا کام کیا اور پڑھے لکھے عالم فاضل لوگ بھی۔

خواجہ ملک علیؒ کی اولاد میں ایک بزرگ خواجہ ایزد بخش نام کے تھے۔ وہ پانی پت میں محلہ انصار میں رہتے تھے۔ ان کے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ پھر ۱۸۳۷ء میں ان کے ایک اور لڑکا پیدا ہوا جس کا نام الطاف حسین رکھا گیا۔ یہی الطاف حسین تھے جنھوں نے حالؔی کے نام سے سارے ہندوستان میں شہرت پائی۔ اور علم اور ادب کے میدان میں بڑے بڑے کام کیے اور پانی پت کا نام سارے دیس میں روشن کیا۔

حالی کا بچپن

الطاف حسین کی ماں کی صحت اچھی نہ تھی۔ ان کے دماغ پر کچھ اثر تھا۔ ابھی وہ نو برس کے بھی نہ ہوے تھے کہ ان کے باپ خواجہ ایزد بخش کا انتقال ہوگیا۔ ماں پہلے ہی سے بیمار تھیں ۔ اب ان کی تربیت اور دیکھ بھال کا فرض ان کے بھائی نے جو عمر میں ان سے کافی بڑے تھے۔ اٹھایا۔ ان کا نام خواجہ امداد حسین تھا۔ اولاد کوئی تھی نہیں۔ ان کو بھائی بھاوج نے بیٹے کی طرح رکھا۔

پانی پت میں یہ رواج تھا کہ چھوٹی عمر سے بچوں کو قرآن شریف زبانی یاد کرایا جاتا تھا جسے حفظ کرنا کہتے ہیں اور ساتھ ہی قرأت سکھائی جاتی تھی۔ قرأت کا مطلب ہے خاص لہجے میں، بڑی صحت اور خوش آوازی کے ساتھ قرآن شریف کو پڑھنا۔

دستور تھا کہ چار برس چار مہینے چار دن کی عمر میں بچے کو مولوی (جو قاری[1] بھی ہوتا تھا) کے پاس پڑھنے بٹھا دیتے تھے۔ الطاف حسین بھی جب چار برس چار مہینے چار دن کے ہوئے تو ان کی بسم اللہ ہوئی اور انھیں مکتب[2] میں داخل کر دیا گیا۔

---

[1] علم قرأت کے مطابق قرآن مجید پڑھنے والا۔
[2] مکتب۔ جہاں بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔

قاری حافظ ممتاز حسین عالم اور بڑے اچھے قاری تھے۔ وہی الطاف حسین کے استاد تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ بچّہ بہت ذہین اور بہت شوقین ہے۔ حاؔلی نے چند سال کے اندر پورا قرآن شریف پڑھ لیا اور زبانی بھی یاد کرلیا۔ کہتے ہیں کہ وہ اس قدر اچھی آواز اور صحیح طریقے سے قرآن شریف پڑھتے تھے کہ لوگ جھوم جھوم اٹھتے تھے۔

پانی پت کے ایک اور عالم سیّد جعفر علی سے الطاف حسین نے فارسی پڑھی اور بچپن سے ان کو فارسی زبان اور ادب سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ فارسی کے ساتھ انھوں نے عربی بھی پڑھنی شروع کردی۔ پانی پت کے ایک بڑے مذہبی عالم حاجی ابراہیم حسین سے الطاف حسین نے عربی پڑھنی شروع کی۔ مگر یہ سب وہ اپنے شوق سے کرتے رہے۔ باقاعدہ تعلیم کا موقع انھیں کبھی نہیں ملا۔ مگر علم کا شوق اور ذہانت اتنی تھی کہ اس کی کسر پوری ہوجاتی تھی۔

اسی زمانے میں پہلے حاؔلی کے باپ کا انتقال ہوا اور کچھ عرصے بعد ماں بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں اور اب ان کی ساری دیکھ بھال اور ذمہ داری بہن بھائی کے سر آگئی جو انھیں بہت چاہتے تھے اور ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ اور کیوں نہ چاہتے وہ تھے بھی تو خوش مزاج، کہنا ماننے والے، بزرگوں کا ادب اور خدمت کرنے والے۔ ساتھ ہی بہت ذہین اور پڑھنے میں بہت شوقین بھی! بھلا ایسے بچّے سے کون پیار نہ کرے گا۔

حالی کا بیاہ اور دلّی کا سفر

پرانے زمانے میں بیاہ شادی اکثر کم عمریں ہو جایا کرتی تھی۔ ابھی حالی سترہ برس ہی کے تھے کہ بھائی بہنوں کو شوق ہوا کہ ان کی شادی کر دیں۔ بڑے بھائی کی کوئی اولاد نہ تھی۔ سوچا ہوگا چھوٹے بھائی کا بیاہ ہوگا۔ بچّے ہوں گے تو گھر میں رونق ہو جائے گی۔

حالی ابھی بیاہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ابھی تو وہ بہت کچھ پڑھنا اور علم حاصل کرنا چاہتے تھے جو شادی کے بعد بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ روزی کمانے کی فکر کرنی پڑتی ہے۔ بال بچّوں کا خرچ اٹھانا پڑتا ہے۔ کتنی ذمّہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ لیکن اس زمانے کے بزرگ لڑکے لڑکیوں سے پوچھتے ہی کب تھے۔ پھر حالی بھائی کو باپ کی جگہ سمجھتے تھے۔ کیسے ان کی بات نہ مانتے۔ بزرگوں کے حکم پر سر جھکانا پڑا اور بڑے چاؤ سے بھائی، بھاوج، بہنوں وغیرہ نے ان کی شادی ان کے ماموں کی بیٹی اسلام النساء سے کر دی۔

شادی تو ہو گئی مگر علم کی پیاس اور بڑھ گئی۔ اس زمانے میں یہ دستور بھی تھا کہ شروع میں لڑکی اپنے میکے[1] میں زیادہ رہتی تھی۔ پھر اسلام النساء کا میکہ

---

[1] میکہ۔ باپ کا گھر۔

اچھا کھاتا پیتا تھا۔ ابھی حالی پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔

حالی پانی پت میں جو پڑھ سکتے تھے وہ پڑھ چکے تھے۔ دلّی کا انھوں نے بہت ذکر سنا تھا کہ وہاں بڑے بڑے عالم، ادیب، شاعر وغیرہ ہیں۔ ان کو اب یہ لگن لگی کہ دلّی جاکر علم حاصل کریں۔ مگر کیسے جائیں؟ بھائی بہن، بیوی، سسرال والے کوئی بھی تو اس پر راضی نہ ہوتا۔ دلّی تھی بھی تو بہت دور۔ فاصلہ تو پانی پت سے دلّی کا ۵۵ میل ہی کا تھا مگر یہ وہ زمانہ تھا کہ نہ ٹرینیں تھیں نہ بسیں۔ نہ موٹر تھی نہ سائی کل۔ اونٹ گاڑی میں جسے شکرم کہتے تھے یا بیل گاڑی میں سفر کیا جاتا تھا۔ جن کے پاس پیسہ نہ ہوتا وہ پیدل چل کر جاتے تھے۔

حالی کے پاس پیسہ بھی نہ تھا۔ کسی سے کہہ بھی نہ سکتے تھے۔ مگر دل میں ٹھان لیا تھا کہ دلّی جاکر پڑھنا ہے۔

سترہ برس کا لڑکا یہ اندازہ کر بھی کیسے سکتا تھا کہ راستے میں کتنی مشکلیں اٹھانی پڑیں گی۔ علم کا ایسا شوق تھا کہ بس کسی اور بات کی فکر نہ تھی۔

ایک دن چپکے سے رات کے وقت گھر سے نکلے اور دلّی کی طرف چل پڑے۔ ایک لگن تھی ایک شوق تھا جو راستہ دکھا رہا تھا اور ہر مصیبت جھیلنے پر اکسا رہا تھا۔ پانی پت سے دلّی چلے۔ چلتے رہے چلتے رہے۔ جوتے پھٹ گئے، پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ کانٹوں نے پیر زخمی کر دیے۔ راستہ میں دو چار بار کسی بیل گاڑی وغیرہ میں بھی تھوڑا راستہ طے کیا۔ مگر زیادہ تر پیدل ہی چلا کیے۔ اس طرح دکھ اٹھاتے مصیبتیں جھیلتے آخر منزل پر پہنچ گئے۔

دلّی پہنچے تو اتنے بڑے شہر میں نہ کسی سے جان نہ پہچان۔ نہ پیسہ پاس۔

انھوں نے اس زمانے کے حالات بہت کم کسی کو بتائے ہیں۔ مگر ان کے بیٹے خواجہ سجاد حسین نے اپنی ڈائری میں کچھ حال لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ دلّی پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ جامع مسجد کے قریب ایک مسجد میں ایک مدرسہ[1] ہے جو "حسین بخش کا مدرسہ" کہلاتا ہے اور ایک بڑے عالم نوازش علی اس میں لڑکوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ اس زمانے میں دستور تھا کہ اکثر مسجدوں میں مدرسے بھی ہوا کرتے تھے اور غریب لڑکوں کو عالم لوگ مفت پڑھاتے تھے۔ جن لڑکوں کے رہنے کا ٹھکانا نہ ہوتا وہ وہیں مسجد میں سو رہتے تھے۔

الطاف حسین پوچھتے پاچھتے کسی طرح اس مسجد میں پہنچ گئے اور مولوی نوازش علی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ مولوی صاحب نے دیکھا کہ یہ لڑکا تو بہت ذہین بہت شوقین ہے تو شوق سے انھیں تعلیم دینے لگے۔ حالی کے رہنے کا کہیں ٹھکانا نہ تھا وہیں مسجد کے فرش پر سو رہتے۔ تکیہ نہ تھا بستر نہ تھا۔ سر کے نیچے دو اینٹیں رکھ لیا کرتے تھے۔ جو ملتا وہ کھا لیتے۔ غالباً مولوی صاحب کے کھانے میں شریک ہوتے ہوں گے۔

دلّی میں اس وقت بڑے بڑے شاعر، ادیب اور عالم موجود تھے۔ مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ مولوی نوازش علی کے ساتھ ان کی ان بڑے بڑے عالم فاضل لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ مشاعروں میں بھی جانے لگے اور خود بھی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ مولوی نوازش علی کے علاوہ دلّی میں انھوں نے ایک اور عالم مولوی فیض حسن اور دوسرے مولوی امیر احمد اور میاں سید نذیر حسین سے بھی علم حاصل کیا۔

---

[1] مدرسہ۔ اسکول

اس زمانے میں ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا چرچا ہونے لگا تھا اور دلّی میں ایک اسکول اینگلو عربک اسکول کے نام سے چل رہا تھا۔ مگر پرانے طرز کے عالم لوگ انگریزی پڑھنا بُرا سمجھتے تھے اور حالی کے استاد تو بہت ہی خلاف تھے اس لیے حالی نے اس اسکول میں جانا تو بڑی بات شاید نام بھی نہ سنا ہو۔

دلّی میں حالی کی ملاقات کئی بڑے شاعروں سے ہوئی۔ ان میں مرزا غالب بھی تھے جن کا دلّی میں بہت شہرہ تھا۔ حالی کو غالب اور ان کا کلام بہت پسند آیا اور ان کے دل پر غالب کی شخصیت کا اتنا گہرا اثر ہوا جو زندگی بھر رہا۔ انھوں نے آگے چل کر غالب کی سوانح عمری بھی لکھی اور مرثیہ بھی لکھا۔ یہ دونوں چیزیں لاجواب ہیں۔

دلّی کے قیام کے زمانے میں حالی نے شعر کہنے شروع کیے تو اپنا تخلص "خستہ" رکھا۔ (شاعر اپنا ایک نام رکھ لیتا ہے اور اس کو ہی شعر میں استعمال کرتا ہے۔ اسی کو تخلص کہتے ہیں)، لیکن پھر شاید مرزا غالب کے کہنے سے انھوں نے اپنا تخلص بدل کر حالی کر دیا۔ یہی نام ہے جس سے وہ دنیا میں مشہور ہوئے۔

اسی زمانے میں حالی نے مرزا غالب کو اپنی کچھ غزلیں دکھائیں۔ غالب بہت کم کسی کو شعر کہنے کا مشورہ دیتے تھے۔ مگر حالی کی غزلیں انھیں پسند آئیں اور انھوں نے کہا "میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا۔ مگر تمھاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر ظلم کروگے۔" بہت بڑی بات کہہ دی غالب نے۔ اور اس سترہ اٹھارہ سال کے لڑکے میں جو شاعری کا جوہر چھپا ہوا تھا اُسے پہچان لیا۔ اس سے حالی کی ہمت بڑھ گئی اور وہ جی سے شعر کہنے لگے۔ مگر وہ صرف شعر تھوڑے ہی کہتے تھے۔

نثر بھی لکھتے تھے۔اسی زمانے میں انھوں نے عربی میں ایک چھوٹی سی کتاب لکھی اور اپنے استاد نوازش علی کو دکھائی۔ مگر یہ کتاب ان کے خیالات سے مختلف تھی۔ مولوی صاحب کو غصہ آیا اور کتاب جھر جھر کر کے پھاڑ ڈالی۔ لکھنے والے کو اپنی لکھی کتاب سے، وہ بھی پہلی کتاب سے، بہت محبت ہوتی ہے وہ اُسے اپنا بڑا کارنامہ سمجھتا ہے۔ مگر حالیؔ استاد کی اتنی عزت کرتے تھے کہ کچھ نہ کہا اور سارا صدمہ دل پر جھیل لیا اور پھر لکھنے پڑھنے میں لگ گئے۔

حالیؔ پڑھ رہے تھے، علم و شعر کی محفلوں میں شرکت کرتے تھے۔ شعر کہتے تھے۔ عربی فارسی اور دوسرے خاص خاص علم سیکھتے تھے اور جی لگاکر علم کے دریا سے سیرابؔ[1] ہو رہے تھے۔ مگر یہ زیادہ دن نہ ہو سکا۔ ڈیڑھ برس سے کچھ ہی زیادہ ہوا ہوگا کہ ان کے بھائی خواجہ امداد حسین کو خبر مل گئی کہ الطاف حسین دلّی میں ہے اور پڑھ رہا ہے۔ ظاہر ہے سب لوگ ان کے لیے بے قرار تھے۔ خواجہ امداد حسین خود دلّی آئے۔ بھائی تک پہنچے اور حکم دیا کہ میرے ساتھ پانی پت چلو وہاں سب لوگ تمھارے لیے بے قرار ہیں۔

حالیؔ کا دل تو نہ چاہتا تھا مگر بھائی کا حکم تھا۔ ٹال نہیں سکتے تھے ۱۸۵۵ء میں وہ دلّی چھوڑ کر پھر واپس پانی پت آگئے۔ مگر یہاں آکر بھی لکھنے پڑھنے کا شغل نہ چھوٹا اور اس میں لگ گئے۔

مگر بال بچّوں والے کے لیے سکون سے پڑھنا کہاں ممکن تھا۔ اب بیوی بھی ساتھ رہتی تھیں۔ ایک بچّہ بھی ہو چکا تھا جس کا نام اخلاق حسین رکھا گیا اس بچّے کو بڑے بھائی نے گود لے لیا تھا اور وہ انھیں کا بیٹا کہلاتا تھا۔ حالیؔ

---

[1] سیراب ہونا۔ پیاس بجھانا۔

نے بھی جہاں ان کا ذکر لکھا ہے " برادر زادہ[1] " کہہ کر لکھا ہے۔ جائیداد تو تھی مگر اتنی نہ تھی کہ سارے خاندان کا خرچ چل سکتا۔ زمانہ سستا تھا مگر آمدنیاں کم تھیں۔ اب سب کا اصرار شروع ہوا کہ الطاف حسین نوکری کریں اور خاندان کا بوجھ بٹائیں۔ ان کی عمر بیس سال کی ہو چکی تھی۔ خود بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا۔ بھائی پر سے بوجھ کم کرنے کی لگن بھی تھی۔ رہا علم کا شوق تو وہ جان کے ساتھ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جس کو علم کا سچا شوق ہوتا ہے وہ ساری عمر اسے حاصل کرتا رہتا ہے اور کر سکتا ہے۔

آخر نوکری کی تلاش ہوئی اور بہت کوشش کے بعد ان کو ۱۸۵۶ء میں حصار شہر میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں تھوڑی سی تنخواہ پر ایک جگہ مل گئی اور وہ پانی پت سے حصار چلے گئے۔

---

[1] برادر زادہ - بھائی کا بیٹا۔

غدر

اس زمانے میں ملک بھر میں گڑبڑ اور پریشانی، لوٹ مار اور ہنگامے برپا تھے۔ انگریز ہندوستان پر رفتہ رفتہ قبضہ جماتے جا رہے تھے اور دلّی کی مغل حکومت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ ہندوستانیوں میں یہ احساس بڑھ رہا تھا کہ انگریز ہم پر حاکم بن جائے گا تو ہمیں تباہ کر دے گا۔

غرض بڑا ہی پریشانی کا زمانہ تھا۔ ۱۸۵۷ء میں وہ پہلی جنگ آزادی چھڑ گئی جسے انگریزوں نے "غدر" کا نام دیا۔ بات یہ ہے کہ جو کامیاب ہو جائے وہ جنگ آزادی ہے اور جو ناکام ہو جائے اسے بغاوت کہہ دیا جاتا ہے۔ ملک کی بدحالی اور بد انتظامی اور انگریزوں کا ظلم دیکھ کر آزادی کے مجاہدوں نے بغاوت کر دی اور بدیسی لوگوں سے لڑائی شروع کی۔ انگریزوں نے باہر سے ہتھیار اور فوج منگائی اور اس لڑائی کو کچل دیا اور سخت بدلہ لیا ہزاروں کو مار کر بھی انھیں چین نہ پڑا۔ بے قصوروں کو بھی سولیاں دی گئیں۔

غرض اس پہلی جنگ آزادی کو کچل دیا گیا اور اسے "غدر" کا نام دیا گیا۔ لاکھوں مارے گئے۔ لاکھوں بے گھر ہو گئے۔ لوگوں نے بہت دکھ جھیلے طاقت سے اس وقت کے ہندوستانیوں اور ہندوستان کو کچل دیا گیا اور پھر ملک میں ملکہ وکٹوریا کی باقاعدہ حکومت قائم کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔

مگر یہی چنگاری تھی جواندر ہی اندر سلگتی رہی اور نوّے برس بعد ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے سپوتوں نے ہندوستان کو انگریزی حکومت سے آزاد کرالیا اور ہندوستان میں جمہوری راج قائم ہوا۔

اس وقت حالؔی حصار میں نوکر تھے۔ اور جگہ کی طرح یہاں بھی گڑبڑ مچی اور حالؔی کو وہاں رہنا مشکل معلوم ہوا۔ یوں بھی ایسے زمانے میں ہر کسی کی تمنّا ہوتی ہے کہ اپنے وطن اور عزیزوں میں رہے انھوں نے اللہ کا نام لیا اور جان ہتھیلی پر رکھ کر حصار سے پانی پت کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں جو کچھ گزری اس کا کچھ حال ان کے بیٹے سجاد حسین نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے۔

"والد[1] جس گھوڑی پر سفر کر رہے تھے وہ بھی ڈاکوؤں نے چھین لی اور آپ کے پاس صرف ایک حمائل[2] باقی رہ گئی۔"

جو سامان اور روپیہ تھا وہ اور گھوڑی لیٹروں نے چھین ہی لی تھی، راستے میں بہت تکلیفیں اٹھائیں۔ بھوک اور پیاس جھیلی اور کئی دن کی مشکلوں اور پریشانیوں کے بعد پانی پت پہنچے۔ اس سفر میں ان کی صحت بہت خراب ہو گئی۔ پانی پت میں حکیم کا علاج ہوا تو کافی دن بعد طبیعت ٹھیک ہوئی۔ مگر اس سفر میں جو بیماریاں لگ گئی تھیں انھوں نے عمر بھر ان کو ستایا۔

پانی پت میں دلّی کے مقابلے میں امن و امان تھا۔ دلّی کے کتنے ہی لوگ بھاگ کر پانی پت آ گئے اور یہاں کے لوگوں نے بڑی محبّت اور اپنائیت سے ان کو اپنے گھروں میں اور دلوں میں جگہ دی اور ہر ممکن

---

[1] والد۔ باپ۔

[2] حمائل۔ چھوٹا سا قرآن شریف جسے گلے میں ڈال لیتے ہیں۔

مدد کی۔ دو تین خاندان حالی کے ہاں بھی آئے اور یہیں رس بس گئے۔
ایک کم عمر لڑکی بھٹکتی بھٹکاتی، خاندان بھر کے شہید ہونے کے بعد کسی طرح پانی پت پہنچی اور حالی کے گھرانے میں پناہ لی۔ ان کا نام "بی مثریا" تھا اور بڑھاپے میں ان کو میں نے خود دیکھا تھا۔ وہ حالی کی پوتی کے پاس رہتی تھیں جو ان کی خدمت کیا کرتی تھیں۔ خود حالی ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور بڑا خیال رکھتے تھے۔ ان بی مثریا کا دس سال کی عمر میں بیاہ ہو گیا تھا اور ان کا دولھا بھی "غدر" میں مارا گیا تھا۔ پھر ساری عمر انھوں نے بیاہ نہیں کیا۔ جب تک ہاتھ پاؤں چلتے رہے سی پرو کر، محنت کر کے، اپنا خرچ چلاتی رہیں۔ جب معذور ہو گئیں تو حالی اور ان کی پوتی مشتاق فاطمہ نے خدمت اور محبت کا حق ادا کر دیا۔

"غدر" کا ہنگامہ ختم ہونے کے بعد بھی ملک میں خوف اور پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر شخص گھر اور وطن سے نکلتے ڈرتا تھا کہ کب انگریز پکڑ کر سولی دے دے یا کوئی الزام لگا کر مار ڈالے۔

حالی اب کے پانی پت آئے تو پورے چار سال وہاں رہے۔ اس وقت نہ کوئی ملازمت تھی نہ ملنے کی امید۔ مگر انھوں نے اس فرصت سے یہ فائدہ اٹھایا کر دل وجان سے علم حاصل کرنے میں لگ گئے۔ اردو، عربی، فارسی اور کئی دوسرے علم سیکھتے رہے۔ پڑھتے رہے اور اپنی قابلیت بڑھاتے رہے۔ انھوں نے خود لکھا ہے "اس زمانے میں پانی پت کے مشہور فضلا[1]، مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی ... سے بغیر

---

[1] فضلا۔ عالم لوگ۔

کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق کبھی حدیث[1] کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت نہ ہوتا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم اور ادب کی کتابیں ..... اکثر دیکھتا تھا..."

اس چار سال میں حالی کے کئی بچے ہوئے۔ اخلاق حسین بڑے بیٹے تو بھائی کے بیٹے بن گئے تھے۔ دو ایک بچے مر بھی گئے ہاں ایک بیٹی عنایت فاطمہ اور سب سے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین زندہ رہے۔ خواجہ سجاد حسین علی گڑھ کالج کے سب سے پہلے بی۔ اے تھے کرکٹ کے پہلے کپتان اور یونین کے صدر بھی رہے۔ تعلیم کے میدان میں نوکری کی اور بہت کام کیا اور نام پایا۔

---

[1] قرآن و حدیث کے مذہبی علم۔

حالی پھر پانی پت سے باہر نکلے

اب ملک میں ملکہ وکٹوریہ نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہندوستان میں جو افراتفری پھیلی ہوئی تھی وہ بھی کم ہوئی۔ دلی میں بھی امن وامان ہوگیا۔ حالی کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ کام کرنا ضروری تھا۔ آخر وہ پھر روزی کی فکر میں پانی پت سے دلی روانہ ہوئے۔ اگرچہ "غدر" نے دلی کو تباہ و برباد کر دیا تھا پھر بھی علم اور ادب کا کچھ چرچا باقی تھا۔ شاعر اور عالم لوگ اب بھی پائے جاتے تھے۔ حالی یہاں آئے تو پھر شعر اور ادب کی محفلوں میں شرکت کرنے لگے۔

یہاں ان کی ملاقات غالب سے تو رہتی ہی تھی۔ وہ نواب مصطفیٰ علی خاں شیفتہ سے ملے۔ جو دلی کے قریب ایک ریاست جہانگیر آباد کے رئیس تھے۔ شیفتہ نواب تو تھے ہی شاعر بھی تھے اور بہت اچھے ذوق کے انسان تھے۔ حالی سے ملے تو ان کی شخصیت اور علم و ادب اور انسانیت سے بہت متاثر[1] ہوئے۔ اور انھوں نے حالی سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ جہانگیر آباد چل کر رہیں اور ان کے لڑکوں کے اتالیق[2] بن جائیں۔

---

[1] متاثر ہونا۔ اثر لینا۔ [2] اتالیق۔ استاد۔ ٹیوٹر

حالی نے منظور کرلیا۔ دلّی قریب تھی۔ دونوں اکثر دلّی آتے جاتے رہتے اور غالب سے، جن سے دونوں کو بڑی محبت اور عقیدت تھی، ملتے رہتے تھے۔ دہاں بھی انھوں نے اپنا مطالعہ جاری رکھا۔ غالب سے اب دوستی بھی تھی اور استاد اور شاگرد کا رشتہ بھی تھا۔ مگر حالی لکھتے ہیں کہ غالب سے زیادہ انھیں شیفتہ کے ساتھ سے فائدہ ہوا اس لیے کہ شیفتہ کا ذوقِ ادب اور شاعری بہت اونچے درجے کا تھا۔ مگر غالب سے حالی کی محبت بڑھتی گئی۔ ۱۸۶۹ء میں مرزا غالب کا انتقال ہوگیا۔ حالی کو بہت صدمہ ہوا۔ انھوں نے غالب کا ایک مرثیہ لکھا جو اتنا عمدہ اور پر اثر ہے جس کا جواب اردو شاعری میں مشکل سے مل سکتا ہے۔ یہاں ہم چند شعر دے رہے ہیں۔ جب موقع ملے تو پورا مرثیہ پڑھیے گا تبھی اس کی خوبیاں پوری طرح معلوم ہوں گی۔

بلبلِ[1] ہند مرگیا ہیہات[2] — جس کی تھی بات بات میں اک بات
یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم — یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج — اپنا بیگانہ اشک بار[3] ہے آج
غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد — کس سے خالی ہوا جہاں آباد[4]

ہند میں نام پائے گا اب کون — سکہ اپنا جمائے گا اب کون
اُس نے سب کو بھلا دیا دل سے — اُس کو دل سے بھلائے گا اب کون

---

[1] غالب کو ہند کی بلبل کہا ہے۔ [2] ہیہات۔ ہائے افسوس۔ [3] اشک بار۔ آنسو بہا رہا ہے۔ [4] جہاں آباد۔ دلّی کا ایک نام۔

اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے　　جا کے دلّی سے آئے گا اب کون

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

سارا مرثیہ ایسے ہی بلکہ اس سے بڑھ کر شعروں کا مجموعہ ہے! ابھی حالیؔ اس غم سے سنبھلے نہ تھے کہ ۱۸۶۹ء ہی میں ان کے دوست اور سرپرست شیفتہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ بڑا صدمہ ہوا۔ ساتھ ہی کام بھی اب وہاں کرنے کو نہ رہا۔ انھیں نئی نوکری کی فکر لگ گئی۔

مگر اللہ کارساز ہے۔ حالیؔ کے علم و فضل اور شاعری کی شہرت پھیل رہی تھی اور لوگ ان کی قدر کرنے لگے تھے۔ پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو نے اپنے ہاں ان کو ملازمت پیش کی اور حالیؔ دلّی سے لاہور چلے گئے۔

یہاں ان کے ذمّہ یہ کام کیا گیا کہ جو کتابیں بک ڈپو سے انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوا کریں۔ حالیؔ ان پر نظرثانی[1] کریں اور ان کی زبان درست کیا کریں۔

یہ کام حالیؔ نے بڑی محنت اور کوشش سے کیا۔ اس سے ان کو ایک بڑا فائدہ بھی ہوا۔ وہ انگریزی بہت کم جانتے تھے مگر اب انگریزی کتابوں کا ترجمہ پڑھنے کو ملنے لگا اور انھوں نے انگریزی ادب، شاعری اور تنقید کی کتابوں کے ترجمے سے اتنا کچھ سیکھ لیا کہ اچھے اچھے انگریزی جاننے والے بھی نہ سیکھ پاتے تھے۔

لاہور کے قیام میں ان کی زندگی میں ایک انقلاب آیا۔ اب تک وہ

---

[1] نظرثانی۔ دوسری بار ٹھیک کرنا۔

رواجی شاعری کرتے تھے۔ یعنی غزل، قصیدہ، مرثیہ وغیرہ کہتے تھے مگر ان کے دل میں یہ لگن تھی کہ وہ شاعری سے کوئی ایسا کام لیں جو ملک و قوم کے لیے فائدہ مند ہو۔ اور بھی کچھ لوگ اس کوشش میں تھے کہ شاعری کا رنگ بدل دیں۔ اردو کے ایک اور بڑے ادیب مولانا محمد حسین آزاد بھی اس زمانے میں لاہور میں تھے۔ انھوں نے لاہور میں نئے طرز کے مشاعرے شروع کیے جس میں غزلیں نہیں پڑھی جاتی تھیں بلکہ لمبی لمبی نظمیں کسی ایک موضوع پر لکھی جاتیں اور شاعر وہ نظمیں ان میں پڑھتے۔ ان مشاعروں کا نام انھوں نے مناظمے رکھا تھا یعنی جہاں نظم پڑھی جائے۔

حالی کو یہ نئی چیز بہت پسند آئی۔ ان مناظموں کی چار نشستیں[1] ہوئیں۔ حالی نے ان میں چار مسلسل نظمیں جن کو مثنوی بھی کہہ سکتے ہیں لکھ کر پڑھیں۔ ان کے نام 'برکھارت'، 'امید'، 'تعصب اور انصاف' اور 'حب وطن' ہیں۔ یہ نظمیں بہت پسند کی گئیں۔ خاص طور پر برکھارت اور حب وطن کا تو جواب نہیں۔ اردو میں اتنی خوبصورت نظمیں آج تک نہ لکھی گئی تھیں سیدھی سادی دل کش زبان میں دل سے نکلی باتیں دل میں جاکر اتر جاتی تھیں۔ برکھارت کے کچھ شعر پڑھیے۔ ؎

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا — اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے — اور پیچھے ہیں دَل کے دَل ہوا کے
گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں — جنّت کی ہوائیں آ رہی ہیں
کرتے ہیں پپیہے "پی ہو پی ہو" — اور مور جھنکارتے ہیں ہر سو

---

[1] نشست۔ بیٹھک۔ جلسہ۔

کوئل کی ہے کوک جی بھاتی گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
ابر آیا ہے گھر کے آسماں پر کلمے[1] ہیں خوشی کے ہر زباں پر

کچھ عرصے بعد یہ مناظمے بند ہوگئے مگر حالی کو نئے انداز کی شاعری کی جو لگن لگ چکی تھی وہ باقی رہی۔ انھوں نے اس کے بعد کئی نظمیں اور لکھیں جن میں 'چپ کی داد' اور 'بیوہ' کی مناجات' بہت پسند کی گئیں اور بہت مشہور ہوئیں۔

لاہور میں حالی نے نثر کی بھی کئی کتابیں لکھیں۔ لکھنا پڑھنا تو ان کی زندگی تھا۔ وہ کبھی خالی رہ نہیں سکتے تھے۔ وہ لاہور چار سال کے لگ بھگ رہے۔ بہت کام کیا۔ بہت سی نئی نئی باتیں سیکھیں اور سکھائیں۔ بہت سے لوگوں سے میل جول ہوا۔ ان کی شہرت بھی اب دور دور تک پھیل گئی تھی۔ ان کی قابلیت اور شاعری کا چرچا ہر جگہ ہونے لگا تھا۔

مگر لاہور میں ان کی صحت اچھی نہیں رہی۔ اول تو وہ تھے ہی کمزور اور یہاں کا پانی اور ہوا بھی ان کے مزاج کو راس نہیں آیا۔ دل بھی نہیں لگتا تھا۔ پانی پت اور اس سے زیادہ دلی یاد آتی تھی۔ آخر دلی کی محبت اور کشش انھیں پھر دلی لے آئی۔ دلی کے "اینگلو عربک کالج" میں عربی کے استاد کی جگہ حالی کو پیش کی گئی اور انھوں نے اُسے قبول کر لیا۔ یہ وہی مدرسہ تھا جس میں پہلی بار دلی آکر حالی نے جاکر جھانکا تک نہ تھا۔ مگر ان کی قابلیت اور علمیت کا شہرہ سن کر خود کالج والوں نے ان کو بلایا وہ بڑی

---

[1] کلمے۔ لفظ

محنت اور توجّہ سے طالب علموں کو پڑھانے لگے۔ جن لوگوں نے یہاں ان سے پڑھا تھا وہ ان سے بہت محبّت کرتے اور ان کا بڑا احترام[1] کرتے تھے۔

دلی آکر ذرا روزی کی طرف سے بے فکری ہوئی تو انھوں نے لکھنے پڑھنے کا کام اور بڑھا دیا۔ اب ان کو یہ فکر تھی کہ اپنی شاعری سے کوئی ایسا بڑا کام کریں جس سے قوم اور ملک کو فائدہ پہنچے۔

---

[1] احترام۔ عزت۔

حالی اور سرسیّد

اب کے دلّی میں ان کی ملاقات سرسیّد احمد خاں سے ہوگئی۔ آپ نے سرسیّد کا نام ضرور سنا ہوگا۔ ان کے دل میں قوم کا بڑا درد تھا۔ ان کو لگن تھی کہ قوم کے بچّوں کو مشرقی تعلیم کے ساتھ مغربی تعلیم بھی دی جائے۔ انگریزی پڑھائی جائے اور انھیں اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی روزی کما سکیں اور ملک کے انتظام اور کاموں میں حصّہ لے سکیں۔ وہ بڑے دل اور دماغ کے آدمی تھے۔ ان کے دل میں سارے ملک کے لوگوں کی محبّت اور درد تھا مگر مسلمانوں کی حالت اس وقت بہت خراب تھی اور انگریزی حکومت بھی مسلمانوں کے بہت خلاف تھی۔ اس لیے سرسیّد چاہتے تھے کہ مسلمان لڑکے انگریزی تعلیم پائیں اور ان کے خلاف جو تعصّب حکومت کو ہے وہ دور ہو۔ اس مقصد[1] کے لیے انھوں نے علی گڑھ میں ایک کالج کھولا جس کا نام ایم۔ اے۔ او کالج[2] تھا۔ بعد میں یہ کالج یونیورسٹی بنا اور آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے جس میں ہزاروں مسلمان اور ہندو اور ہر قوم اور مذہب کے لوگ تعلیم پاتے ہیں۔ اس کالج میں اردو، عربی

---

[1] مقصد۔ کام۔ [2] محمڈن اینگلو اورینٹل کالج۔

فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی اور مغربی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے۔ شروع میں اس کالج کی بڑی مخالفت ہوئی۔ بات یہ تھی کہ مسلمان انگریزوں سے بدگمان تھے اور اسی وجہ سے انگریزی زبان کے مخالف تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو بھی انگریزی پڑھے گا "فرنگی" بن جائے گا۔ یعنی اپنے مذہب سے دور ہو جائے گا۔ اور بھی بہت سی باتیں خلاف کہی جاتی تھیں۔ سرسید نے ساری مخالفت کو بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ سہا مگر اپنا کام کرتے رہے اور آہستہ آہستہ لوگ ان کے کام کو سمجھنے اور ان کا ساتھ دینے لگے۔ وہ ملک بھر میں دورے کرتے۔ تقریریں کرتے۔ کالج کے لیے چندہ کرتے اور سمجھ دار لوگوں کو اس کام کی اہمیت[1] سمجھاتے تھے۔ کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ اردو ادب میں بھی اصلاح چاہتے تھے اور اردو نثر لکھنے کا نیا ڈھنگ انھوں نے خود بھی اختیار کیا اس کے لیے ایک رسالہ تہذیب الاخلاق نکالا اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں سے بھی کہا کہ وہ نئے طرز کی نظمیں اور نثر لکھیں جس سے قوم اور ملک کو فائدہ ہو۔

حالی پہلے سرسید کو زیادہ نہ جانتے تھے اور کچھ تھوڑے سے بدگمان بھی تھے۔ مگر جب دلی میں ان کی ملاقات سرسید سے ہوئی تو پہلی ہی بار میں وہ ان سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے خلوص اور کام کی اہمیت کو سمجھ گئے اور ان کے دل و جان سے ساتھی بن گئے۔ سرسید سے ملنے کے بعد انھوں نے ان کے کالج کے لیے بہت کام کیے۔ جلسوں میں تقریریں کیں۔ نظمیں کہہ کر پڑھیں۔ چندے کیے خود کالج کے معاملوں میں صلاح مشورے دینے لگے اور اپنے وطن پانی پت کے لڑکوں کو تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجا

---

[1] اہمیت۔ اہم ہونا۔ ضروری ہونا۔

شروع کیا۔ جو بہت غریب ہوتے ان کا خرچ خود اٹھاتے تھے۔ حالؔی کے بیٹے خواجہ سجاد حسین جن کے بارے میں ہم پہلے بتا چکے ہیں، علی گڑھ ایم۔اے۔او کالج کے پہلے گریجویٹ تھے۔

حالؔی سرسید سے یوں بھی بہت متاثر ہوئے کہ انھوں نے ان سے کہا کہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں شاعری سے بڑے بڑے کام لیے جاتے ہیں۔ آپ بھی اپنی شاعری سے قوم کو جگانے اور اس کو سدھارنے کا کام لیجیے۔ سرسید نے جو کہا تھا حالؔی نے اسے یوں لکھا ہے:

" قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے غیرت[1] دلائی کہ خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے۔ شریف خاک میں مل گئے۔ علم کا خاتمہ ہو چکا۔ دین[2] کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس[3] کی گھر گھر پکار ہے ...... ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے ... نظم کہ سب کو مرغوب[4] ہے ..... قوم کو بیدار کرنے کے لیے کسی نے نہیں لکھی۔"

سرسید کی باتوں کا حالؔی کے دل پر بہت گہرا اثر ہوا اور انھوں نے ایک ایسی ہی نظم لکھنے کی ٹھان لی جس سے مسلمانوں کو غیرت دلائی جائے اور سوتے سے جگا کر نئی تعلیم اور نئی زندگی کی طرف متوجہ کیا جائے۔

---

[1] غیرت۔ شرم۔ [2] دین۔ مذہب۔ [3] افلاس۔ غریبی۔ [4] مرغوب۔ پسند۔

مسدس حالی

بقول ایک مشہور دانشور[1] کے سرسید کی وجہ سے "قوم کو شاعر مل گیا اور شاعر کو قوم مل گئی" سرسید کے اکسانے پر حالی نے وہ نظم لکھی جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے۔

اب حالی نے اور کاموں کو پیچھے ڈالا، اپنی پریشانیوں، بیماریوں، ذمہ داریوں کو بھول کر وہ بڑی نظم لکھنے میں لگ گئے۔ مسدس اس نظم کو کہتے ہیں جس کے ایک بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔

انھوں نے مسلمانوں کو پہلے تو یہ بتایا کہ تم کیا تھے، تم نے کتنے بڑے بڑے اچھے اچھے کام کیے تھے، دنیا میں تمھاری شہرت تھی، عزت تھی۔ قابلیت کے چرچے تھے لیکن وہ سب ختم ہوگیا اب تم جہالت، مفلسی اور دوسری بہت سی خرابیوں میں مبتلا ہو چکے ہو۔ انھوں نے تعصب، تنگ نظری، قدامت پرستی، فضول خرچی، شیخی وغیرہ جو اس وقت بہت عام تھیں ان کی خرابیاں گنائیں۔ جاہل، کاہل اور بے عمل لوگوں کو للکارا۔ محنت اور کام کرنے والوں کی تعریف کی۔ قوم کو سمجھایا کہ اصل عزت علم سے ہوتی ہے

---

[1] دانشور۔ بہت عقل مند آدمی۔

اور کام سے ہوتی ہے۔ تبھی تم دنیا میں عزت کی زندگی گزار سکتے ہو۔ یہ سب ایسے پر اثر اور درد بھرے انداز میں کہا کہ پڑھ کر دل ہل جاتے ہیں۔ پھر آخر میں نا امیدی میں امید کی کرن دکھائی۔ کہا ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ سوتے سے جاگ جاؤ، ہوش میں آجاؤ تو کچھ بن جاؤ گے اور مردہ قوم زندہ ہوجائیگی۔

دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنی برائیاں اور خرابیاں سن کر، جان کر، سبق لیتے ہیں اور اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے جو بگڑ جاتے ہیں اور اس شخص کے مخالف اور دشمن ہوجاتے ہیں جو ان کی خرابیاں بتائے۔

مسدس حالی جب پہلے پہل چھپ کر آئی تو ایک ہل چل مچ گئی۔ زیادہ تر لوگوں نے اس کا بہت اثر لیا۔ اس کی بہت تعریف کی۔ لوگ پڑھتے تھے اور روتے تھے۔ محفلوں اور مجلسوں اور گھروں میں اور باہر اس کے بند پڑھے جاتے تھے۔ یوں تو سبھی نے تعریف کی مگر سب سے زیادہ اس کی قدر سرسیّد نے کی۔ حالی کو لکھا "اگر خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا لایا اور کچھ نہیں"۔ انھیں اس پر فخر تھا کہ حالی نے ان کے کہنے پر یہ بے مثال نظم لکھی ہے۔

لیکن مخالفت بھی کم نہیں ہوئی۔ پرانے طرز کے لوگوں نے برا بھلا کہا۔ خاص کر پرانے طرز کی شاعری کے چاہنے والوں کی طرف سے بہت مخالفت ہوئی۔ اخباروں اور رسالوں میں مضمون لکھے گئے۔ حالی کے وزن پر خالی اور ڈفالی نام کے شاعروں سے نظمیں لکھوا کر ان کے خلاف شائع کی گئیں۔ خوب خوب حالی پر کیچڑ اچھالی گئی۔

حالی نے کسی مخالفت کا جواب نہیں دیا۔ برا نہیں مانا۔ سنتے، پڑھتے

اور مسکرا کر چپ ہوجاتے۔ کسی ایسے ہی موقع پر انھوں نے یہ شعر کہا تھا ؎

کیوں کر کہیں کہ کیسے سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

مگر یہ سب مخالفتیں زیادہ دن نہ چل سکیں۔ مسدس حالی اپنی اُسی شان اور آن کے ساتھ اب سو برس کے لگ بھگ ہو چکے لوگوں میں مقبول اور محبوب ہے۔ آج بھی لوگ اُسے پڑھ کر جھوم جھوم اٹھتے ہیں۔ اس کی خوبیوں پر سر دھنتے ہیں۔ اور اُسے اردو زبان کی سب سے پُر اثر اور ایمان دار نظم مانا جاتا ہے۔

مسدس حالی لکھی تو مسلمانوں کے لیے گئی تھی۔ مگر اُسے پسند سب نے کیا۔ اس لیے کہ یہ ایسی نظم ہے جس سے سب لوگ سبق سیکھ سکتے ہیں۔ اردو کے ایک مشہور نقّاد رام بابو سکسینہ تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب تاریخِ ادبِ اردو میں مسدس کے لیے لکھا ہے:۔

"وہ ایک ایسی کتاب ہے جو پیمبروں اور اوتاروں پر نازل ہوتی ہے۔ وہ ایسا تارا ہے جو شاعری کے آسمان پر چمکا اور ہندوستان میں اس کی وجہ سے قومی اور وطنی نظموں کا لکھنا شروع ہوا ..... ان کے مخاطب صرف ان کے اہلِ مذہب ہی نہیں بلکہ کل اہلِ وطن ہیں ....."

مسدس حالی کو جب تک پورا نہ پڑھا جائے اس کی خوبیوں کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ہم کہیں کہیں سے کچھ بند نمونے کے طور پر یہاں لکھتے ہیں۔ جب موقع ملے تو پوری کتاب پڑھنی چاہیے۔

حضرت محمدؐ اسلام کے پیمبر کی شان میں جو چند بند مسدس میں لکھے ہیں

۱۔ نکتہ چیں۔ اعتراض کرنے والا

وہ لاجواب ہیں۔ ایک بند پڑھیے :۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا[1] ضعیفوں کا ماوا
یتیموں کا والی غلاموں کا مولا[2]

محنت کرکے روٹی کمانے والوں اور کام کرنے والوں کی تعریف اور بڑائی انھوں نے بہت کھلے دل سے کی ہے۔ اردو شاعری میں اس سے پہلے کسی نے اس طبقے کو یوں نہیں سراہا تھا۔ ایک بند دیکھیے ؎

یہ برکت ہے دنیا میں محنت کی ساری　　جہاں دیکھیے فیض اس کا ہے جاری
یہی ہے کلیدِ[3] درِ فضلِ باری　　اسی پر ہے موقوف عزت تمھاری
اسی سے ہے قوموں کی یاں آبرو سب
اسی پر ہیں مغرور ہم اور تُو سب

انھوں نے بڑے درد سے لوگوں کو سمجھایا کہ اگر قوم تباہ ہوئی تو ہم بھی ساتھ تباہ ہوں گے۔ کشتی ڈوبتی ہے تو اچھے برے سبھی اس میں بیٹھنے والے ڈوب سکتے ہیں۔ اس لیے قوم کی ڈوبتی کشتی کو بچانے کی کوشش کرنا ہر ایک کا فرض ہے۔

---

[1] ملجا و ماوا۔ سرپرست۔ سہارا [2] مولا۔ آقا۔ مالک [3] کلیدِ درِ فضلِ باری۔ خدا کے فضل کے دروازے کی کنجی۔

کوئی ان سے پوچھے کہ اے ہوش والو کس اُمید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو
بُرا وقت بیڑے[1] پہ آنے کو ہے جو نہ چھوڑے گا سوتوں کو نے جاگتوں کو
بچو گے نہ تم اور نہ ساتھی تمھارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

اس طرح ایک ایک خرابی ایک ایک بُرائی بتاتے اور شرم دلاتے ہیں۔ پھر آخر میں ناامیدی میں امید کا دامن تھامے رکھنے کی نصیحت کرتے ہیں بلکہ گویا خود اپنے سے کہتے ہیں کہ ناامید نہ ہونا چاہیے ؎

بس اے ناامیدی نہ یوں دل دکھا تُو جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تُو
ذرا ناامیدوں کی ڈھارس بندھا تُو فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تُو
ترے دم سے مُردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں

مسدس حالی اب سے لگ بھگ سو برس پہلے چھپی تھی۔ تب سے اب تک اس کے سینکڑوں اڈیشن نکلے ہیں اور بہت سی ہندوستانی زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہوا ہے۔ کئی غیر ملکی زبانوں میں بھی چھپی ہے۔

مولانا حالیؔ چاہتے تھے کہ مسدس کا کاپی رائٹ (آمدنی کا حق)، سرسید کے ایم۔ اے کالج کو دے دیا جائے۔ مگر سرسید اس نظم کو قوم کی ملکیت کہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ زیادہ سے زیادہ چھپے اور ہر کوئی اس کو پڑھے۔ انھوں نے کہا یہ نظم ساری قوم کی دولت ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ گانے والیاں اس کو محفل میں گائیں۔ قوّال قوالی کی محفلوں میں سنائیں۔ یہ مدرسوں میں

---

[1] بیڑا۔ کئی کشتیوں کا قافلہ

پڑھائی جائے۔ عام لوگ اس کو پڑھیں اور سبق حاصل کریں۔ لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں۔ چنانچہ حالیؔ نے اسے قوم کو دے ڈالا۔

عام دستور ہے کہ ہر ادیب اور شاعر اپنی کتابوں کا حقِ تصنیف لیتا ہے۔ لیکن مولانا حالیؔ نے نہ صرف مسدس حالی کی کوئی رائلٹی نہیں لی بلکہ اور بھی کئی کتابوں کو یوں ہی قوم کو دے ڈالا کہ جس کا جی چاہے چھاپے اور بیچے۔ وہ کوئی امیر آدمی نہ تھے۔ تھوڑی سی آمدنی تھی مگر دل کے بادشاہ تھے۔ اور جو بات اپنی کتابوں اور شعروں میں کہتے تھے چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک وہ بات پہنچ جائے۔ اور ہر پبلشر ان کی کتاب شائع کرسکے۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔

مسدس حالی کی زبان بھی بہت خوبصورت، سندر، اور دل میں اتر جانے والی ہے۔ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی ذرا غور سے پڑھے تو اس کا مطلب سمجھ جاتا ہے۔ جو شاعری اور ادب سب کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی زبان دلکش، آسان اور عوام کی زبان کے قریب ہو۔

حیدرآباد سے وظیفہ

اس زمانے میں حیدرآباد کی ریاست بڑے عالموں اور ادیبوں اور قوم کے خادموں کو وظیفہ دیا کرتی تھی تاکہ وہ سکون سے اپنا کام کرسکیں اور روزی کی فکر سے آزاد رہیں۔ حالی بارہ برس سے اینگلو عربک کالج میں پڑھا رہے تھے۔ ۱۸۸۶ء میں سرسید نے ان کی ملاقات حیدرآباد کے وزیر سر آسماں جاہ بہادر سے کرائی۔ وہ پہلے ہی سے حالی کو جانتے تھے۔ ان کی چیزیں پڑھی تھیں ان کی شہرت سنی تھی۔ اب ملے تو اور زیادہ متاثر ہوئے۔ پھر سرسید نے جو حالی کے بڑے قدر دان اور چاہنے والے تھے ان سے حالی کی تعریف کی اور کہا کہ ان کا حیدرآباد سے وظیفہ ہونا چاہیے۔

سرآسماں جاہ نے حیدرآباد واپس جاکر حالی کا پچھتر روپے مہینے کا وظیفہ کروادیا۔ حیدرآباد کا روپیہ "حالی" کہلاتا تھا اور اس کی قیمت ہندوستانی روپے سے کم تھی۔ اس سلسلے میں کسی نے ایک لطیفہ کے طور پر کہا تھا۔

"حالی ہی کا سکہ ہے جو چلتا ہے دکن میں"

اس میں ایک تو 'ہ' اور 'ح' کا ذرا سا فرق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حیدرآباد والے حالی کے بہت مداح اور قدردان تھے۔ حالی جب

حیدرآباد گئے تو وہاں کے لوگوں نے ان کی دل وجان سے میزبانی کی اور ان کے لیے بڑے بڑے جلسے کیے اور تقریروں میں بڑی تعریفیں کی تھیں۔

ہاں تو حالؔی کا حیدرآباد سے وظیفہ ہوگیا۔ اب اینگلو عربک کالج کی تنخواہ اور وظیفہ مل کر اتنا ہوگیا کہ حالؔی چاہتے تو فراغت سے زندگی بسر کرسکتے تھے۔ مگر حالؔی نے کہا کہ یہ وظیفہ مجھے علمی اور ادبی کام کرنے کے لیے دیا گیا ہے اس لیے اب میں نوکری نہیں کروں گا۔ زمانہ سستا تھا۔ حالؔی جیسے سلیقہ مند اور با اصول آدمی جو اپنے پر کم سے کم خرچ کرتا ہو اتنے میں بھی گزارا کرسکتا تھا۔ انھوں نے اینگلو عربک کالج کی نوکری چھوڑدی اور فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنے وطن پانی پت میں جاکر رہیں گے اور وہاں رہ کر کام کریں گے۔ دلّی میں اب یوں بھی دل نہ لگتا تھا کہ اب وہ دوست، وہ احباب، وہ قدردان باقی نہ رہے تھے جن کے دم سے دلّی دلّی تھی۔

اسی زمانے میں حالؔی کے بھائی خواجہ امداد حسین کا انتقال ہوگیا جس کا ان کو سخت صدمہ ہوا۔ وہ ان کو باپ کے برابر جانتے تھے۔ انھوں نے ایک مرثیہ بھی ان کے مرنے پر کہا تھا جس کے چار شعر پڑھیے۔

آئے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے
موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آئی

پر بھائی ہو جس شخص کا حالؔی کا سا بھائی
غم بھائی کا مرجانے کی ہے، دل کی نشانی

بولیں گے بھی سو بار ہنسیں گے بھی جہاں میں
یہ ناؤ ہے ہر طرح ہمیں پار لگانی

پر آہ کلی وہ کہ جو مرجھا گئی دل کی
مشکل ہے وہ ہنس بول کے آپس میں کھلائی

بھائی کے بعد یہ اور ضروری ہوگیا کہ وہ وطن میں جاکر خاندان کے ساتھ رہیں۔ دلّی کے عزیز دوستوں شاگردوں اور عقیدت مندوں کو ان کے دلّی چھوڑنے کا بہت قلق تھا مگر اب حالی کا بڑھاپا بھی آگیا تھا اب ہر طرح سے وطن جاکر رہنا مناسب تھا۔

حالی پانی پت میں

حالی کے بزرگوں کا مکان محلہ انصار میں تھا۔ بہت بڑا اور اچھا مکان تھا۔ پرانے طرز کا۔ بڑے بڑے دالان، صحنچیاں[1]، کوٹھریاں، بڑا سا چبوترہ، خوب بڑا صحن اور کئی کئی ڈیوڑھیاں وغیرہ۔ پہلے حالی اسی میں جاکر رہے مگر اس گھر میں خاندان کے بہت سے لوگ رہتے تھے۔ خواجہ اخلاق حسین ان کے بال بچے اور دوسرے لوگ۔ دوسرے یہ مکان شہر کے بیچوں بیچ تھا اور ہر وقت ملنے جلنے والے آیا کرتے تھے اور حالی کو سکون سے کام کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔

انھوں نے طے کیا کہ وہ محلہ سادات میں جو وہاں سے میل ڈیڑھ میل تھا، اپنے ماموں اور سسر کے مکان میں کچھ تبدیلی کرا کے، وہاں جاکر رہیں گے۔ بڑے گھر کے پاس ایک چھوٹا سا پرانا سا گھر تھا حالی نے اسے نئے طرز کا بنوایا اوپر دو کمرے اور صحن وغیرہ تھا۔ نیچے بیٹھک تھی۔ اوپر کے کمرے کی ایک کھڑکی نیچے زنانہ مکان کے صحن میں کھلتی تھی۔ (جو برابر میں تھا)، خود حالی کے پاس تو پیسہ کہاں تھا۔ خواجہ سجاد حسین اب نوکر ہو گئے تھے اور وہ

---

[1] صحنچیاں۔ چھوٹے چھوٹے دالان جو بڑے دالانوں کے اندر ہوتے تھے۔

باپ کو خرچ بھیجتے تھے۔ بہت سستا زمانہ تھا۔ تھوڑے سے روپوں میں گھر بن گیا اور اس طرح حالی ۱۸۹۶ء میں محلہ سادات میں اٹھ آئے۔ یوں دوست احباب، شاگرد، عزیز، صلاح مشورہ لینے والے یہاں بھی آتے رہتے تھے مگر پھر بھی ان تھک کام کرنے والے حالی کو یہاں لکھنے پڑھنے کا زیادہ موقع ملتا تھا۔

شام کو بیٹھک میں محفل جمتی تھی۔ چائے اس زمانے میں نئی نئی چلی تھی۔ حالی کو چائے کا بہت شوق تھا۔ شام کو برابر چائے بنتی رہتی اور چائے بسکٹ کا دور دوستوں میں چلتا رہتا۔ ان کے دو ملازم عطاء اللہ اور نانوں خاں برابر چائے بنا کر لاتے رہتے تھے اور یہ وقت تھا جب وہ لوگوں سے ملتے اور ان کے دکھ سکھ سنتے۔ مشورے دیتے اور دلچسپ گفتگو کرتے باہر سے مہمان جو آتے وہ بھی نیچے کے گھر میں ٹھہرائے جاتے تھے۔

دن بھر حالی اوپر کے گھر میں ایک بڑے تخت پر بیٹھ کر کام کرتے رہتے تھے۔ کھڑکی اس تخت کے پاس تھی۔ نیچے کے زنانہ گھر سے بچوں کے بولنے، کھیلنے، رونے ہنسنے کی آوازیں آتی رہتیں کبھی عورتوں کے جھگڑوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ کام کرتے کرتے نیچے جھانکتے اور ایک دو بات کر لیتے۔ لڑائی سنتے تو کہتے اب دونوں وقت مل رہے ہیں مت لڑو۔ اس وقت تو بھٹیاریاں بھی نہیں لڑتی ہیں۔

حالی کا خاندان بہت بڑا تھا اور وہ سب سے بہت محبت کرتے تھے۔ شادی بیاہ اور دوسرے موقعوں پر ہر جگہ شرکت کرتے۔ جھگڑے نبٹاتے۔ عزیزوں سے ملنے جاتے۔ گھر بلا کر مہمان رکھتے۔ تحفے دیتے اور اُن کی ضرورتیں پوری کرتے۔ گھر کے اندر کا سب کام اور انتظام ان کی بیوی بی اسلام النساءؔ

اور خواجہ سجاد حسین کی بیوی، حالی کی بہو جو بی اسلام النساء کی بھتیجی تھیں دونوں مل کر کرتی تھیں۔ ساس بہو میں جھگڑا ہوتا تو حالی دونوں کو سمجھا کر صلح کرا دیتے تھے۔

حالی کو خاندان کی لڑکیوں سے خاص طور پر بہت محبت تھی اور ان کی تعلیم تربیت کی بہت فکر رہا کرتی تھی۔ سب سے پہلے انھوں نے اپنی بڑی پوتی مشتاق فاطمہ کی تعلیم کی طرف توجہ کی تھی۔ یہ بھی مزے کا قصہ ہے۔ اس زمانے میں ان کے ہاں کی عورتیں قرآن حدیث اور اردو تو پڑھنے لگی تھیں مگر لکھنا بہت بُرا سمجھا جاتا تھا۔ مشتاق فاطمہ کو پڑھنے کے ساتھ لکھنے کا بھی شوق پیدا ہوا۔ ان کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور حالی کی بھاوج نے ان کو بیٹی بنا لیا تھا۔ انھیں کے پاس رہتی تھیں۔ دادی سخت مزاج کی تھیں اگرچہ پوتی کو بہت چاہتی تھیں۔ اب مشتاق فاطمہ نے یہ کیا کہ توے کی سیاہی سے روشنائی بنائی اور سرکنڈے کا قلم تراشا اور چھپ چھپ کر اپنی کتاب میں سے نقل کرنے لگیں۔ جب ان کی دادی کو خبر ہوئی تو بہت خفا ہوئیں۔ مولانا حالی آئے تو ان سے بڑے طنز سے بولیں " مبارک ہو الطاف — پوتی نے لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اب وہ خط پتر لکھا کرے گی"۔ اس زمانے میں یہ گویا بڑی گالی تھی۔ حالی نے سنا، بلا کر پوتی سے پوچھا، لکھا دیکھا اور بہت شاباشی دی اور بھاوج کو سمجھا دیا کہ مشتاقا ضرور لکھنا سیکھے گی اس میں کوئی بُری بات نہیں ہے۔ چنانچہ اب ان کو اجازت مل گئی تو وہ کھلے بندوں لکھنا سیکھنے لگیں۔ بعد میں حالی نے ایک لڑکیوں کا اسکول بھی قائم کیا تھا جس میں خاندان کی اور دوستوں کی لڑکیاں پڑھا کرتی تھیں۔ اپنا ایک گھر اسکول کے لیے دیدیا۔ لڑکیوں کے آرام کا خیال رکھتے۔ دلی

سے ایک استانی بلوائی۔ کئی سال یہ اسکول چلا مگر پھر کوئی استانی نہ ملنے کی وجہ سے بند ہوگیا مگر لڑکیوں کے پڑھنے لکھنے کا جو رواج شروع ہوگیا تھا وہ ختم نہ ہوا اور بعد میں کئی اور اسکول پانی پت میں لڑکیوں کے قائم ہوئے۔

ان کے بہت سے دوست اور مداح[1] تھے۔ حالی ان سب کا خیال رکھتے اور ان کے گھر والوں کی بھی فکر رکھتے تھے۔ کسی کو نوکری دلوانے کی کوشش کرتے، کسی کو کالج میں داخلہ دلاتے، کسی کا خرچ اٹھاتے۔ ان کے ہندو دوست بھی تھے اور ان کے کام بھی وہ اسی طرح آتے تھے اور ایک سا دوستی اور اپنائیت کا سلوک کرتے تھے۔ اسی لیے تو سب پانی پت والے ان کو اپنا سرپرست اور ہمدرد سمجھتے اور بے حد عزت کرتے تھے۔

۱۸۹۸ء میں سرسید کا انتقال ہوگیا۔ حالی کو بہت سخت صدمہ ہوا۔ وہ ان کے دوست بھی تھے اور راہ بر[2] بھی۔ ان کے قدر دان بھی اور چاہنے والے بھی۔ ایک جلسے میں سرسید نے حالی کے بارے میں کہا تھا:۔

"ہمیں فخر کرنا چاہیے اور خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم میں ایک ایسا آدمی پیدا ہوا ہے جس پر قوم کے عالموں اور شاعروں کو فخر ہونا چاہیے۔ آنے والے زمانے میں کہا جاوے گا کہ وہ قوم کو زندہ کرنے والا اور راہ دکھانے والا تھا....."

ایک بار سرسید شملے گئے ہوئے تھے۔ وہاں حالی کو مہمان بلایا۔ حالی نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا سرسید نے خط میں لکھا۔
"شملے میں میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کون سی نعمت ہوسکتی

---

[1] مداح۔ تعریف کرنے والے [2] راہ بر۔ راستہ دکھانے والا۔

ہے کہ چند روز آپ کی صحبت رہے۔ میرا رمضان بیچ بیچ عیسد ہو جاوے گا۔۔۔۔۔"

سید محمود سرسید کے بیٹے اور بہت قابل اور بہت ذہین آدمی تھے اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ مگر حالیؔ کے لیے ایک بار انھوں نے سرسید سے کہا:۔

"ابا جانی اگر خدا مجھ سے سوال کرے گا کہ میرے جتنے بندوں سے تو ملا ہے ان میں کون ایسا ہے جس کی پرستش[1] کرنے کو تیرا دل تیار ہو جائے۔ تو میرے پاس جواب حاضر ہے کہ وہ شخص الطاف حسین حالیؔ ہے۔"

جس خاندان سے ایسے تعلقات ہوں ان کا صدمہ حالیؔ کا اپنا صدمہ تھا۔ ویسے بھی سرسید کا غم تو پورے ملک میں منایا گیا تھا۔ مگر حالیؔ تو صابر آدمی تھے۔ بڑے صبر اور حوصلے سے اس صدمہ کو بھی جھیلا۔ فارسی میں انھوں نے ایک بہت عمدہ مرثیہ سرسید کا لکھا ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر انھوں نے وہ کام کیا جو کوئی اور نہ کر سکتا تھا۔ وہ کافی دن سے سرسید کی سوانح عمری[2] لکھ رہے تھے مگر وہ پوری نہ ہوئی تھی۔ کئی بار ان کا جی چاہا کہ سرسید کو دکھائیں مگر پھر جھجک گئے۔ اب ان کو یہ قلق تھا کہ کاش سرسید اس سوانح عمری کو پڑھتے۔ غرض انھوں نے صدمہ کو دل میں چھپایا اور سرسید کی سوانح عمری پوری کرنے میں جُٹ گئے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ جلدی اسے پورا کر دو تو خوب بک جائے گی۔ مگر حالیؔ کا کوئی کام جلدی اور ٹالنے کے لیے نہ ہوتا تھا۔

---

[1] پرستش۔ پوجا۔ عبادت۔ [2] سوانح عمری۔ زندگی کے حالات۔

انھوں نے کہا یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کام کتنے دن میں ہوا۔ یہ سب دیکھتے ہیں کہ کام کیسا ہوا۔

سال بھر دل و جان سے وہ اس کتاب کو لکھتے رہے۔ اور ۱۹۰۱ء میں ہزار صفحے کی یہ کتاب "حیاتِ جاوید" کے نام سے شائع ہوئی۔ "حیاتِ جاوید" کا مطلب ہے "ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی"۔

یہ حالی کی نثر کی کتابوں میں سب سے بڑی اور بہترین کتاب ہے۔ سرسیّد پر اس درجہ کی کتاب اس وقت کیا آج تک نہیں لکھی گئی۔ اس میں ان کی سیرت شخصیت اور ان کے بے مثال کاموں پر مفصّل روشنی ڈالی گئی ہے۔ اردو میں آج تک جتنی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں "حیاتِ جاوید" ان سب میں اپنا ایک الگ مقام اور بلند درجہ رکھتی ہے۔ سرسیّد کے کاموں کو سمجھنے اور ان کی شخصیت کو پہچاننے میں اس کتاب کا بڑا ہاتھ ہے۔

حالی نے اس سے پہلے جب غالب کا انتقال ہوا تھا تو ان کی سوانح عمری بھی لکھی تھی۔ اس کا نام ہے "یادگارِ غالب"۔ اس میں انھوں نے غالب کی دلکش اور غیر معمولی شخصیت پر مفصّل روشنی ڈالی ہے۔ پھر غالب کی شاعری سے بحث کی ہے اور ان کے اعلیٰ درجہ کے مگر مشکل شعروں کو بڑے آسان اور دل نشین[1] انداز میں سمجھایا ہے۔ یہ اردو کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور اس سے غالب کو سمجھنے اور پرکھنے اور ان کے کلام کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

---

[1] دل نشین۔ دل میں بیٹھ جانے والے۔ دل میں اتر جانے والے۔

ایک اور سوانح عمری حالی نے فارسی کے مشہور شاعر سعدی شیرازی کی بھی لکھی ہے۔ اور اس طرح انھوں نے اردو میں تین اعلیٰ درجہ کی سوانح عمریاں لکھ کر اردو زبان میں ایک نئی چیز پیش کی جس کی آج تک قدر کی جاتی ہے۔

شمس[1] العلما

اس زمانے میں حکومت بہت بڑے درجے کے عالموں کو شمس العلماء کا خطاب دیا کرتی تھی جس کا مطلب ہے "عالموں میں سورج کی طرح روشن" ۱۹۰۴ء میں حالی کو حکومت ہند کی طرف سے یہ خطاب دیا گیا۔ حالی تو نام نمود، شہرت وغیرہ کی پروا کرتے ہی نہ تھے بلکہ الٹے ان سے بچتے اور گھبراتے تھے۔ ان کے مزاج میں ایک قسم کا حجاب[2] بھی تھا اور بہت انکسار بھی۔ مگر حالی کے عقیدت مندوں، دوستوں، عزیزوں وغیرہ کو بہت خوشی ہوئی۔ حالی کے پاس بہت سے مبارک باد کے خط آئے۔ ان میں مولانا شبلی کا خط سب سے اچھا ہے۔ وہ خود بہت بڑے عالم تھے۔ ان کو بھی یہ خطاب ملا تھا۔ سنا جاتا ہے کہ حالی سے ان کو رشک بھی تھا اور وہ ان کی کتابوں پر تنقید اور اعتراض بھی کرتے تھے۔ مگر اس زمانے کے لوگوں کے دل بڑے ہوتے تھے۔ آپس کی تھوڑی سی مخالفت میں بھی شرافت ہوتی تھی۔ ہاں تو شبلی نے مولانا حالی کو مبارک باد کے خط میں لکھا:۔

"مولانا — آپ کو تو نہیں خطاب شمس العلماء کو مبارک باد

---

1. شمس العلماء۔ لفظی معنی "عالموں کا سورج" 2. حجاب۔ شرم۔ جھجک

دیتا ہوں۔ اب جاکر اس خطاب کو عزت حاصل ہوئی۔"

ایک جملہ میں کتنی بڑی بات کتنی تعریف کر دی مولانا شبلی نے۔

جن لوگوں کو خطاب ملتا تھا، دستور تھا کہ وہ حاکموں سے ملیں سرکاری جلسوں میں جائیں وغیرہ وغیرہ۔ حالی کو یہ سوچ کر الٹی کوفت ہوئی۔ خواجہ سجاد حسین اپنے بیٹے کو لکھتے ہیں:-

"اگرچہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کی ہمارے ہم چشم[1] آرزو رکھتے ہیں مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہیں ملتا ..... مگر اب جب کوئی حاکم ضلع پانی پت آئے گا ...... مجھے وہاں جانا پڑے گا ..... بھلا میں کہاں اور یہ دردِ سر کہاں ....."

ایک تو وہ بہت خوددار تھے۔ دوسرے اپنا قیمتی وقت بجائے اس قسم کے لوگاں سے ملنے جلنے کے لکھنے پڑھنے میں صرف کرنا چاہتے تھے۔

---

[1] ہم چشم۔ ساتھی۔

حالی۔ بچّے۔ عورتیں

حالی کا دل یوں تو محبّت کا ساگر[1] تھا۔ اس میں ملک کی محبت تھی۔ قوم کی محبّت تھی۔ دوستوں اور عزیزوں کی محبّت تھی۔ علم سے عشق تھا۔ ادب اور شاعری سے الفت تھی۔ خدمت کی لگن تھی۔ لیکن ان سب کے ساتھ اور شاید سب سے بڑھ کر انھیں بچّوں سے الفت تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ آج کا بچّہ قوم کا فرد بنے گا اور اس کے ہاتھوں ملک اور قوم کا مستقبل[2] سنور سکتا ہے۔

بچّوں سے محبّت میں سبھی بچّے شامل تھے۔ اپنوں کے بچّے غیروں کے بچّے، دوستوں کے بچّے اور بالکل انجان بچّے۔ وہ سب سے پیار کرتے تھے۔ ہر بچّہ ان کی توجّہ کا مرکز بن جاتا تھا۔ چھوٹے بچّوں سے ننھی ننھی باتیں کرتے۔ گود میں لے کر پیار کرتے ان کے کھیلوں میں حصّہ لیتے۔ ذرا بڑے بچّے ہوتے تو ان کی تعلیم اور تربیت کا خیال رکھتے۔ کبھی کبھی بچّوں کے لیے شعر بھی کہتے تھے ویسے بھی ان کے کلام میں بہت سے شعر ایسے ہیں جو بچّوں کی پسند کے اور اُن کی سمجھ میں آنے والے ہیں۔

ان کی پوتی مشتاق فاطمہ کی ایک ننھی سی بچّی تھی۔ نام تھا سیّدہ خاتون۔

---

[1] ساگر۔ سمندر [2] مستقبل۔ آنے والا زمانہ

بڑی ذہین اور پیاری بچّی تھی اور حالؔی اُسے بہت چاہتے تھے۔ انھوں نے ایک نظم اس بچّی کے لیے کہی تھی۔ اس کے چند شعر پڑھیے۔ محبّت لفظ لفظ میں بول رہی ہے :۔

سیّدہ کیسی پیاری بچّی ہے ۔۔۔ صورت اچھّی سمجھ بھی اچھّی ہے
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان ۔۔۔ پر سب اچھے بُرے کی ہے پہچان
یوں تو تھی جب ہی پیاری اس کی زباں ۔۔۔ جب کہ کرنے لگی تھی وہ غوں غاں
اب تو آتا ہے اس پہ اور بھی پیار ۔۔۔ ہوتی جاتی ہے جس قدر ہوشیار
نہیں منھ سے نکلتے پورے بول ۔۔۔ بولتی ہے سدا ادھورے بول
لوٹ جاتے ہیں ہنستے ہنستے سب ۔۔۔ زرزری اپنی بولتی ہے جب

ہر چھوٹے بچے پر اس نظم کے شعر پورے اتر سکتے ہیں۔ وہ کام کرتے رہتے اور پوتے نواسے ان کے پاس کھیلا کرتے کسی نے روشنائی گرادی، کسی نے کاغذ پھاڑ دیا مگر وہ ناراض نہ ہوتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ کھڑکی کھول کر نیچے زنانہ گھر میں جھانکتے اور کوئی بچّہ دیکھ لیتا تو وہیں سے چلّاتا "بابا — بابا" حالؔی بڑھاپے اور کمزوری کے باوجود اوپر سے اتر کر نیچے جاتے۔ بچّے کو پیار کرتے دو چار باتیں کرتے اور پھر اوپر جاکر اپنے کام میں لگ جاتے۔

ایک بار پانی پت میں تانگے پر سوار حالؔی سڑک پر جارہے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک نالے کے پاس بہت سے لوگ جمع ہیں اور گھبرا گھبرا کر "رام رام" پکار رہے ہیں۔ مولانا حالؔی نے پاس جاکر پوچھا کیا ہوا۔ معلوم ہوا کسی مہتر کا بچّہ نالی میں گر گیا ہے۔ مگر لوگ بھلا اچھوت کو ہاتھ کیسے لگاتے — اس زمانے میں چھوت چھات بہت زیادہ برتی جاتی

تھی نا۔ مولانا جھکے، بچّے کو نالی میں سے نکالا اور اس کے ماں باپ کے پاس پہنچا دیا۔ اور لوگوں سے کہا

"جس رام کا نام آپ جَپ رہے ہیں اگر چاہتے تو اسی رام کا جلوہ آپ کو اس ننھے بچے میں نظر آسکتا تھا"

جیسا ہم نے پہلے بتایا مولانا حالیؔ کو لڑکیوں کی بھلائی اور تعلیم کی بڑی فکر رہتی تھی۔ عورتوں اور لڑکیوں سے جو غلط سلوک ہوتے تھے اور خراب رسمیں رواج پا گئی تھیں ان پر مولانا حالیؔ نے کئی نظمیں لکھی۔ کسی میں بچپن کی شادی کی خرابیاں۔ کسی میں بے جوڑ بیاہ کی خرابیاں بیان کی ہیں۔ کسی میں عورتوں کی خدمت، محبّت، ایثار اور قربانی کے جذبوں کو سراہا ہے اور قوم سے کہا ہے کہ ان کو تعلیم نہ دینے اور ان کے ساتھ انصاف نہ کرنے کا جواب تمھیں خدا کے سامنے دینا پڑے گا۔ کسی نظم میں کم عمر بیوہ کے جذبات، خیالات اور احساسات کا بیان کیا ہے۔

ان کی ایک نظم "چُپ کی داد" بہت مشہور ہے اور کافی بڑی ہے اس میں انھوں نے عورتوں کی بڑائی بڑے کھلے دل سے بیان کی ہے۔ اس نظم کے چند شعر ہم یہاں دیتے ہیں۔ لیکن جب موقع ملے پوری نظم پڑھیے گا۔ ان شعروں سے آپ کو ذرا سا اندازہ ہوگا کہ یہ کس درجہ کی نظم ہے :-

اے ماؤں، بہنوں، بیٹیوں دنیا کی زینت[1] تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھیں۔ دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے

تم آس ہو بیمار کی، ڈھارس ہو تم ناچار کی
دولت ہو تم نادار[2] کی، عُسرت[3] میں عشرت[4] تم سے ہے

---

[1] زینت۔ سجاوٹ۔ خوبصورتی [2] نادار۔ غریب۔ مفلس [3] عسرت۔ غریبی [4] عشرت۔ عیش و آرام

بچّوں کی سیوا میں تمھیں گزرے ہیں جیسے دس برس
قدر اس کی جانے گا وہی دم پر ہو بیوں جس کے بنی

پیدا اگر ہوتیں نہ تم بیڑا نہ ہوتا پار یہ
چیخ اٹھتے دو دن میں، اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ

ان کی ایک بہت مشہور، بڑی پُر اثر، بڑی دل کش نظم ہے "بیوہ کی مناجات" سچ تو یہ ہے کہ اردو شاعری میں اس نظم کے مقابلے کی کوئی نظم نہیں ہے۔ بلکہ خود حالی کے کلام میں بھی اس کا درجہ بہت اونچا ہے۔

کم عمری میں لڑکیوں کی شادی کر دینا اُس وقت عام بات تھی۔ اور اگر لڑکی کا میاں مر جائے تو وہ کم سن لڑکی ساری زندگی دکھ اور مصیبت اور محرومی کے ساتھ گزارتی۔ نہ دوسری شادی کی جاتی نہ اس کا درد سمجھا جاتا تھا۔ حالی کے درد مند اور حسّاس دل نے اس کو بڑی شدّت سے محسوس کیا اور پھر وہ نظم لکھی جس کو بغیر روئے پڑھنا مشکل ہے۔ ایک کم سن لڑکی جو بیوہ ہو گئی ہے خدا سے فریاد کرتی ہے اور اُسی سے اپنا دکھ درد کہتی ہے جو سب کی سننے والا ہے :-

اے مرے زور اور قدرت والے — حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیاری — دروازے کی تیرے بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن — جان پہ اپنی آپ اجیرن
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں — دنیا سے بیزار چلی ہوں
دل پہ میرے داغ ہیں جتنے — منہ میں بول نہیں ہیں اتنے
میرے بچپن کا ہے رنڈاپا — دور پڑا ہے ابھی بڑھاپا
پھر دل سوچتی ہوں یہ جی میں — آئی تھی کیوں میں اس نگری میں
آ کے خوشی سی چیز نہ پائی — جیسی آئی ویسی نہ آئی

اس نظم کا بیان کرنے کا انداز بے حد دل کش ہے اور زبان اتنی میٹھی، سہل، سرل ہے کہ ہر کسی کی سمجھ میں آجاتی ہے اور دل کو لگ جاتی ہے۔

بچپن کی شادی کے خلاف آواز اٹھانے اور بیوہ کی شادی دوبارہ کرنے کی کوشش میں گاندھی جی سے بھی پہلے جس شخص نے آواز اٹھائی وہ مولانا الطاف حسین حالؔی تھے۔

نثر میں بھی حالؔی نے لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے ایک کتاب لکھی ہے۔ نام ہے مجالس النساء۔ یہ دو حصّوں میں بڑا دل چسپ قصّہ ہے جس میں کہانی کے انداز پر لڑکے لڑکیوں کی تربیت اور تعلیم کے گُر بتائے ہیں۔ اپنے زمانے میں یہ بہت مشہور اور مقبول ہوئی۔ گورنمنٹ پنجاب نے اس پر چار سو روپیے کا انعام بھی دیا تھا۔ اور بہت زمانے تک یہ کتاب پنجاب اور دوسرے کئی صوبوں میں لڑکیوں کے اسکولوں میں کورس میں داخل رہی۔

غرض حالؔی نے عمل سے بھی اور اپنے قلم سے بھی بچّوں بچیوں لڑکے لڑکیوں کی بھلائی کے بہت کام کیے اور اپنی محبّت کا سچّا ثبوت دیا۔

حالی کی سیرت

مولانا حالی میں یوں تو بہت سی صفتیں تھیں۔ وہ بڑے عالم فاضل تھے۔ بڑے ادیب اور شاعر تھے۔ انھوں نے اردو نظم اور نثر کو ایک نئی زندگی نیا روپ دیا۔ سرسید کے ساتھ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے میں بہت کام کیا۔ ساتھ ہی عورتوں کی تعلیم کو رواج دینے میں پہل کی۔ سماج کی اصلاح کے لیے دوسرے کام بھی کیے۔ مگر ان کی سیرت کی بعض خوبیاں ان کاموں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ ان کے دل میں انسانوں کے لیے بہت محبت تھی اور وہ ان کے لیے بہت کچھ کرتے رہتے تھے۔ ان کی دو صفتیں ان کی سیرت کا سب سے اہم حصہ تھیں مولوی عبدالحق نے جو حالی سے بہت محبت کرتے تھے اور ان سے بہت قریب بھی تھے۔ (وہ خود اردو کے بہت بڑے ادیب تھے) لکھا ہے کہ حالی میں دو باتیں بہت نمایاں تھیں "سادگی اور دردِ دل" سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے ان دو لفظوں میں حالی کی سیرت کی تصویر کھینچ دی ہے۔

وہ سادگی اور شرافت کا مجسمہ تھے۔ سادگی ان کے شعر اور ادب کی بھی جان ہے اور ان کی شخصیت کا بھی جوہر ہے۔ وہ سیدھے سادے انداز میں بڑی گہری باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ان کا دل دوسروں کے دکھ غم اور

تکلیف پر تڑپ جاتا تھا۔ ساری زندگی وہ دوسروں کا غم کم کرنے کا کام کرتے رہے۔ ان کو محبّت دیتے رہے۔ خدمت کرتے رہے۔ انھوں نے ایک شعر کہا ہے ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

ملک میں کسی جگہ قحط پڑتا یا کوئی وبا پھوٹ پڑتی تو وہ تڑپ جاتے۔ راتوں کو سو نہ سکتے۔ دن کا چین ختم ہو جاتا۔ کسی دوسرے ملک میں کوئی مصیبت آتی اس پر بھی ان کو سخت پریشانی ہوتی۔ کسی امیر رئیس کو غریبوں یا نوکروں پر زیادتی کرتے دیکھتے تو سخت تکلیف گزرتی۔ ایک بار حیدرآباد میں ان سے ایک رئیس ملنے آئے۔ کوچوان نے گاڑی برساتی سے ذرا آگے کھڑی کر دی۔ رئیس کو غصّہ آیا اور کوچوان کے سر پر کئی ہنٹر رسید کر دیے۔ مولانا حالی اوپر کھڑے یہ دیکھ رہے تھے۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ مولانا کو سخت قلق ہوا اور غصّہ آیا۔ اس رات کھانا نہیں کھایا۔ رات بھر سو نہ سکے بار بار کہتے تھے "ہائے ظالم نے کیا کیا؟"

ان کے مکان کی ڈیوڑھی میں ایک غریب عورت رہتی تھی۔ جوگیا کپڑے اور گلے میں بہت سی مالائیں پہنے رہتی تھی۔ سب اُسے "مامی" کہتے تھے۔ مولانا بھی "مامی" کہتے اور اس کا بہت خیال رکھتے اس کی ہر طرح مدد کرتے اس کے ہاتھ کا پکایا کھانا کھا لیتے۔ باتیں کرتے۔ عزیزوں کی طرح سمجھتے تھے۔

دوستوں اور عزیزوں سے تو سلوک اور محبّت کرتے ہی تھے مگر اپنے نوکروں سے ان کا جو برتاؤ تھا ایسا بہت ہی کم لوگ کر سکتے ہیں۔ لگتا تھا وہ ان کے نوکر نہیں بھائی یا بچّے ہیں۔ ان کے دو خاص ملازم تھے۔ ایک

کا نام تھا نانوں خاں۔ دوسرے کا نام تھا عطار اللہ۔ نانوں خاں کبھی کبھی ان کے بیٹے کے ساتھ بھی چلا جاتا تھا تو اس کے گھر کی خیر خبر رکھتے اور اس کو بال بچوں کا حال لکھتے رہتے تھے۔ وہ کہا کرتا تھا "اجی مولوی صاحب تو ولی آدمی تھے ولی۔ اب ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں انھوں نے کبھی مجھ سے کوئی سخت بات نہیں کہی" ان نانوں خاں کا ایک مزے دار قصّہ ہے۔ ان بچارے کی عادت تھی کہ ذرا چرا چھپا کر بسکٹ کھا لیے۔ دودھ پی لیا۔ گھی کھا لیا۔ سب انھیں کے پاس تو رہتا تھا مگر حالی کبھی ان سے کچھ نہ کہتے تھے۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے کہ حالی دہلی میں تھے۔ مٹی کا تیل نیا نیا چلا تھا اور چھوٹی چھوٹی ڈبیوں میں بھر کر جلایا جاتا تھا۔ مٹی کے تیل کی ایک ڈبیا ٹپک رہی تھی اور اُسے ایک تشتری میں رکھ دیا گیا تھا۔ کسی نے ڈبیا اٹھا کر الگ رکھ دی۔ نانوں خاں جو بازار سے واپس آئے تو دیکھا کہ تشتری میں پگھلا ہوا گھی رکھا ہے۔ بچارے عادت سے مجبور تھے۔ جھٹ اٹھا کر پی لیا۔ اب جو بو آئی تو سمجھے کہ مٹی کا تیل پی لیا۔ روتے پیٹتے حالی کے پاس پہنچے "ارے مر گیا میں۔ ہائے مولوی جی مر گیا۔ مٹی کا تیل پی گیا"

حالی بڑے گھبرائے۔ انھیں بھی معلوم نہ تھا کہ مٹی کے تیل کی کیا تاثیر ہوتی ہے۔ اُسے لٹایا۔ پڑوس سے حکیم صاحب کو بلا کر دکھایا۔ اُس رات حالی کی نواب لُہارو کے ہاں دعوت تھی۔ وہاں بھی نہ گئے۔ آدمی بلانے آیا تو حالی نے انھیں لکھ بھیجا "افسوس ہے حاضر نہیں ہو سکتا۔ نانوں خاں مٹی کا تیل پی گیا ہے۔ اس کی دیکھ بھال کر رہا ہوں"

ایک بار بہت سردی تھی۔ نانوں خاں سوں سوں کرتے پھر رہے تھے

حالی نے پوچھا "نانوں خاں کوئی گرم کپڑا نہیں بنوایا" بگڑ کر بولا "اجی کہاں سے بنواؤں بھلا" حالی نے فوراً اپنی نئی روئی کی صدری اُتاری اور اُسے پہنا دی۔

دوسرا ملازم عطاءاللہ تھا۔ بہرا بھنڈ۔ ایک ٹانگ سے لنگڑا۔ ہاتھ میں بھی کچھ خرابی تھی۔ مزاج بہت ہی خراب تھا۔ ہر وقت چیختا بکتا رہتا تھا۔ حالی نے شاید اسی لیے اُسے رکھ چھوڑا تھا کہ ایسے نوکر کو اور بھلا کون رکھے گا۔ اس کی بدمزاجی ہنس کر سہار لیتے تھے۔ کوئی کہتا "مولانا آج عطاءاللہ کا مزاج بہت گرم ہے" تو ہنس کر جواب دیتے "ہاں بھئی کبھی وہ ہم پر خفا ہو لیتا ہے کبھی ہم اس پر" اگرچہ خود کبھی خفا نہیں ہوتے تھے۔ چائے ناشتے کا سب سامان اس کے پاس رہتا۔ وہ دودھ پی جاتا۔ شکر پھانک لیتا۔ بسکٹ کھا لیتا۔ حالی چپ چاپ پیسے دے کر اور منگا لیتے کبھی یہ نہیں کہتے تھے کہ ابھی تو آئے تھے کیا ہو گئے۔ وہ کہا کرتا تھا "وہ (حالی) کبھی مجھ پر خفا نہ ہوتے تھے۔ سودے سے جو پیسے واپس کرتا ان کو گنتے نہیں تھے ..... اپنے پہننے کے کپڑے مجھے دیتے رہتے تھے۔ ایک بار میں نے کہا بڑی سردی ہے تو فوراً اپنی رضائی جو ابھی سِل کر آئی تھی مجھے دیدی۔ میں نے کہا اجی پرانی دیدو۔ مگر انھوں نے کہا نہیں تم یہی لے لو ہم اور بنوا لیں گے"

وہ دوسروں کے نوکروں اور غریب لوگوں کا بھی خیال اور مدد کرتے تھے۔ تھوڑی سی آمدنی تھی۔ بہت بڑا کنبہ تھا۔ مگر دل بڑا تھا۔ تھوڑی سی آمدنی میں سے بھی اُن کے پاس سے کوئی ضرورت مند خالی ہاتھ واپس نہ جاتا تھا۔

ہاتھ سے کام کرنے والوں کی وہ بڑی قدر اور عزت کرتے تھے۔ اپنے شہر کے جولاہوں کا بُنا ہوا موٹا کپڑا خرید کر پہنتے تھے۔ اپنے یہاں کے دیسی کمبل استعمال کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ نکمّے اور مفت[1] خورے۔ قوم کے ماتھے کا کلنک ہیں۔

ایک بار فرید آباد میں اپنے دوست ڈاکٹر لیاقت حسین کے ہاں ٹھیرے ہوئے تھے۔ نوکروں کی کوٹھریوں میں رات کو کوئی بچہّ بیمار ہو گیا اور رونے لگا۔ حالؔی بے چین ہو گئے۔ حال معلوم کرایا ساری رات پریشان رہے۔ صبح اٹھتے ہی ڈاکٹر لیاقت علی کو اس کے علاج کے لیے بھیجا۔

خاندان والوں کی ہر بیماری اور دکھ کی فکر رکھتے تھے۔ بچوّں کی خاص طور پر۔ ان کے کئی بچےّ ہوئے۔ دو ایک مر گئے۔ تین زندہ رہے۔ بڑے اخلاق حسین۔ چھوٹے سجاد حسین اور ان دونوں کے بیچ کی تھیں عنایت فاطمہ۔ ان سب کی تربیت تعلیم اور ان کے بچوّں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ عنایت فاطمہ کے چھوٹے بیٹے بہت بیمار رہتے تھے۔ حالؔی نے ان کا بہت علاج کرایا۔ دُور دُور سے ان کے لیے دوائیں منگائیں۔ ان کی ضدیں اور ہٹیں سب پوری کرنا چاہتے تھے۔ کوئی بچہّ فیل ہو جاتا تو اس کو ڈانٹنے کی جگہ سمجھاتے اور آگے تعلیم پانے کا شوق دلاتے تھے۔

ان کے چھوٹے بیٹے خواجہ سجّاد حسین بہت قابل تھے۔ جیسا ہم نے بتایا تعلیم کے میدان میں انھوں نے بہت کام کیا۔ ان کے دو بھانجے خواجہ غلام الثقلین اور خواجہ غلام الحسنین غیر معمولی ذہانت اور قابلیت

---

[1] مفت خورے۔ بغیر کچھ کام کیے کھانے والے
[2] ماتھے کا کلنک۔ کالا ٹیکا۔ کالا دھبہّ یعنی شرم ناک ہونا۔

رکھتے تھے۔ خواجہ غلام الحسنین نے مذہب کی بہت خدمت کی۔ اور خواجہ غلام الثقلین نے علم اور ادب کے میدان میں بہت کام کیا اور حالی کے کاموں کو اپنایا۔ حالی ان دونوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ یوں بھی جو بھی نوجوان قابلیت، ذہانت اور ادب و علم کی خدمت کرتا اُس کو چاہتے تھے۔ شیخ اسمٰعیل پانی پتی کی بھی بڑی قدر کرتے تھے۔ انھوں نے مولانا حالی سے بہت کچھ حاصل کیا اور ان پر کئی کتابیں لکھیں۔

مولانا حالی کو اپنی بیوی کی بڑی قدر اور محبت تھی گھر اور خاندان کی بہت سی ذمہ داریاں وہ اٹھایا کرتی تھیں۔ مگر مزاج کی تیز تھیں۔ اپنے اتنے بڑے قابل فاضل میاں سے ذرا نہ دبتی تھیں بلکہ الٹا ڈانٹ لیتیں۔ سارا خاندان حالی کا رعب مانتا تھا مگر وہ جھگڑتی بھی تھیں اور اپنی بات بھی منواتی تھیں اور حالی ہنس کر ٹال جاتے اور اکثر ان کی بات مان لیتے تھے۔ یوں وہ بڑی ہمدرد، خدمت کرنے والی، سخی[1]، سلیقہ مند اور سمجھدار بی بی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے مگر اس زمانے میں میاں بیوی کی زندگی الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ گھر کے اندر بیوی کا راج ہوتا۔ باہر کی ذمہ داریاں میاں اٹھاتا۔ حالی وظیفہ کی ساری رقم (جو پچھتر سے سو روپے ہو گیا تھا)، بیوی کو دیدیتے تھے۔ خود ان کے خرچ کے لیے خواجہ سجاد حسین کچھ روپے بھیجا کرتے تھے۔

۱۹۰۰ء میں اچانک بی اسلام النساء کا انتقال ہو گیا۔ حالی کی پینتالیس برس کی ساتھی بچھڑ گئیں۔ گھر اجڑ گیا۔ سخت صدمہ ہوا۔ مگر اپنے صدمے کو صبر

---

[1] سخی۔ فیاض۔ غریبوں کی مدد کرنے والا

سے جھیلا اور خاندان والوں کو تسلی دلاسا دیا بیٹے کو خط میں لکھتے تھے۔

"اس حادثۂ ناگہانی سے جو صدمہ سب عزیزوں، ہمسایوں اور راہ چلتوں کو ہوا اس کا بیان کرنا مشکل ہے ..... اور میں سمجھتا ہوں کہ سب سے زیادہ صدمہ ان کی اولاد کو ہوا ہے۔ مگر میری جان والدین[1] کا اولاد کے سامنے گزر جانا والدین کی خوش قسمتی ہے اور اولاد کا ورثہ ہے .... تمھاری والدہ کی جیسی عمدہ زندگی اور جیسی عمدہ موت ہوئی ہے اس کی ہر شخص کو تمنا کرنی چاہیے ....."

کئی خطوں میں حالی نے اپنی بیوی کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں بیوی کی کس قدر عزت اور محبت تھی۔

---

[1] والدین۔ ماں باپ

وطن کی محبّت

حالؔی کو اپنے وطن سے محبّت تھی۔ پانی پت سے محبّت تھی جہاں ان کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا گزرا۔ اور وہ زندگی بھر اس کی بھلائی کے لیے کام کرتے رہے۔ انھیں دلّی سے بہت محبت تھی جہاں انھوں نے علم حاصل کیا اور شعر اور ادب کا سبق بڑے بڑے شاعروں اور عالموں سے سیکھا۔ اور بھئی انھیں سارے ہندوستان سے محبّت تھی۔ اس کی مٹی، اس کے پھولوں اس کی ہر ہر پتّی سے الفت تھی۔ انھوں نے اپنے کلام میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے حالی محبِّ وطن کے نام سے ایک مضمون لکھا تھا اس میں وہ کہتے ہیں :-

" اور حالؔی کا وطن کیا تھا؟ پہلے تو حالؔی کا وطن ان کا گھر اور کنبہ اور پانی پت تھا ..... اس کے بعد ان کا وطن بڑھ کر دلّی ہوا ..... اور اب ان کا وطن ہندوستان ہوگیا ..... "

حالؔی کا ایک شعر ہے وطن کی شان میں ؎

تیری اک مشتِ[1] خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

---

[1] مشتِ خاک - ایک مٹھی خاک

اپنی مشہور نظم حبِّ وطن میں انھوں نے پہلے وطن کی محبّت کا ذکر کیا ہے پھر بتایا ہے کہ وطن کی اصلی محبّت، وطن والوں کی محبّت اور ان کی بھلائی کے کام کرنا ہے ؎

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو　　اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
جب کبھی زندگی کا لطف اٹھاؤ　　دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ

وہ سب اہلِ وطن سے محبّت کرتے تھے اور لوگوں سے بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ سب مذہب والوں، سب علاقے والوں سے ایک ساں محبّت کریں۔ وطن کی محبّت کے یہی معنی ہیں ؎

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر　　نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو　　بدھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو　　سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

وہ کہتے ہیں سب کو محبّت اور اتّفاق سے رہنا چاہیے۔

ملک ہیں اتّفاق سے آباد　　شہر ہیں اتّفاق سے آباد

حالی کا مذہب

حالی مسلمان تھے۔ بڑے سچّے اور پکّے مسلمان۔ انھوں نے مذہبی تعلیم کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ مگر ان کے مذہب میں کٹّرپن نہ تھا۔ سچائی حق پرستی۔ لوگوں سے برابری کا سلوک کرنا، ہر ایک کی خدمت اور خیال ان کا اصل مذہب تھا۔ وہ خراب رسموں اور کٹّرپنے کی باتوں کے خلاف تھے۔ ایسی رسمیں اور باتیں جو اصلی مذہب سے آدمی کو دور کرتی ہیں۔ ہر ایک کا دکھ درد دور کرنا اور انسانیت کی اور انسان کی بھلائی کے کام کرنا ہی ان کا اصلی مذہب تھا۔ اسی پر ان کا عمل تھا۔ اسی لیے تو سب ان سے محبّت کرتے تھے۔ ویسے وہ مذہب کے احکام کو بھی دل و جان سے مانتے تھے۔ نماز، روزہ، قرآنِ پاک کی تلاوت اور سب مذہب کے کام کرتے تھے اور اپنے سے چھوٹوں اور بچّوں کو بھی اس کی تعلیم دیتے تھے۔ ساتھ ہی دوسرے مذہبوں کی بھی عزّت کرتے تھے۔ ان کی دوستی اور تعلقات ہندوؤں سے بھی ایسے ہی تھے جیسے مسلمانوں سے۔

حالی کی کتابیں

یوں تو مولانا حالی نے عربی اور فارسی میں بھی لکھا ہے۔ پھر مشکل مشکل علمی کتابیں بھی لکھی ہیں جن کو بڑے عالم ہی پڑھ سکتے ہیں۔ مگر اردو زبان میں انھوں نے سب سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں نثر کا ادب بھی ہے اور نظم اور غزل وغیرہ بھی ہے۔

نثر میں ان کی بہت مشہور کتابیں چار ہیں۔ ان کا ہم پہلے بھی ذکر کر آئے ہیں۔ ایک غالب کی سوانح عمری یادگارِ غالب دوسری سرسیّد کی سوانح حیات حیاتِ جاوید اور تیسری حیاتِ سعدی ان کی چوتھی ایک بہت اہم کتاب مقدمہ شعر و شاعری ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے پرانی شاعری اور نئی شاعری دونوں کا فرق بتایا ہے۔ ان پر تنقید کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ دنیا میں شاعری سے کیا کیا کام لیے گئے ہیں اور ہم خود شاعری سے ملک اور قوم کے فائدے کے کتنے کام لے سکتے ہیں۔ یہ کتاب اردو زبان کی بڑی اہم کتاب ہے اور تنقید پر پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے اور آج تک بڑے سے بڑا نقاد اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اور لوگ بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ یہ کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے اور شاید ہی کوئی ادیب و شاعر ہو جو اس کو نہ پڑھتا ہو۔

لڑکوں لڑکیوں کے لیے مجالس النساء لکھی جو ہم نے بتایا کہ بہت مفید

کتاب ہے۔

نثر میں ان کے بہت سے مضامین بھی ہیں جو مقالاتِ حالی کے نام سے چھپے ہیں۔ ان کے خطوں کے دو مجموعے بھی چھپے ہیں۔ ان کے خط اتنے ہی سادگی اور دلکشی کا نمونہ ہیں جتنے وہ خود تھے۔

شعر انھوں نے بہت کہے ہیں۔ نظمیں تو بہت سی کہی ہیں۔ ان کی چند مشہور نظموں کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ مسدسِ حالی ان کی سب سے مشہور اور بڑی نظم ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بہت پُراثر اور دل کش نظم بیوہ کی مناجات حبِّ وطن۔ برکھارت۔ بھی بہت پسند کی جانے والی اور مشہور نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ مرثیہ غالب ان کی ایک اور ایسی نظم ہے جس کے مقابلہ کی نظم نہیں مل سکتی۔

مولانا حالی نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ پہلے تو وہ پرانی طرز کی غزلیں کہتے تھے مگر پھر بعد میں جب ان کی شاعری کا رُخ بدلا تو انھوں نے غزلوں میں بھی نئے نئے مضمون باندھے اور جدید طرز کی غزلیں کہیں۔ دیوانِ حالی میں ان کے کلام کو جمع کر دیا گیا ہے جس میں رباعیاں وغیرہ بھی ہیں۔ ان کی غزلوں کے چند شعر آپ بھی سن لیجیے ؂

دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا — اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں
بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر — ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

قلق[1] اور دل کا سوا ہو گیا — دلاسا[2] تمھارا بلا ہو گیا
نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت — وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

---

[1] قلق۔ رنج۔ افسوس [2] دلاسا۔ تسلی

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

حالی نے بارہ پندرہ برس کی عمر سے لکھنا شروع کر دیا تھا اور آخر عمر تک برابر لکھتے رہے۔ ان کا اندازِ بیان سادگی اور روانی میں مشہور ہے۔ نثر کے علمی مضامین میں بھی وہ بہت موٹے موٹے عربی فارسی کے لفظ استعمال نہیں کرتے اور ادبی مضامین اور کتابوں میں تو ایسی زبان لکھتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھ کر سمجھ سکیں۔ نظم میں ان کی زبان اور زیادہ رواں، سہل، دل کش اور سندر ہے۔ وہ اردو میں ہندی کے آسان اور خوبصورت لفظ بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر حبِ وطن، برکھا رت، مرثیۂ غالب اور بیوہ کی مناجات تو خوبصورت لفظوں کی ایسی لڑیاں ہیں جیسے سچے سڈول موتیوں کی لڑیاں پرو دی گئی ہوں۔ عام بول چال کی زبان کے لفظ، محاورے بھی وہ استعمال کرتے ہیں اس سے ان کی زبان میں زیادہ میٹھاپن، اپناپن اور خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے۔

آخری زمانہ

مولانا حالی کی صحت اگرچہ دلی کے پہلے سفر اور "غدر" کے زمانے کے سفر میں خراب ہو گئی تھی اور نوجوانی کی یہ بیماریاں عمر بھر ان کے ساتھ رہیں۔ نزلہ، کھانسی، بخار، دمہ وغیرہ رہتا تھا۔ وہ بیماری کا دوا علاج تو کراتے لیکن کام کرتے رہتے تھے تبھی تو انھوں نے اتنی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ہزاروں ہزار صفحے سیاہ کیے ہیں۔ انھوں نے اتنا لکھا، اتنا لکھا، اور پھر اتنا اچھا بھی لکھا جو بہت کم لوگ لکھ سکتے ہیں۔

بڑھاپے میں بھی ہمت اور حوصلہ جوان رہا۔ کام کرتے رہے۔ سفر کرتے رہے۔ دلی تو خیر آتے جاتے رہتے ہی تھے۔ جہانگیر آباد، فرید آباد وغیرہ بھی قریب تھے۔ اس کے علاوہ علی گڑھ کالج کے چندے کے لیے بہت سفر کیے ہیں۔ حیدر آباد، لاہور، پونا وغیرہ وغیرہ جانے کہاں کہاں جاتے تھے۔ حیدر آباد میں بہت عزت اور احترام سے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ان کے لیے بڑے بڑے جلسے ہوئے۔ سپاس نامے دیے گئے اور بہت سراہا گیا۔ آخر عمر تک وہ خطوں کے جواب پابندی سے دیتے رہے۔ ساتھ ہی دوستوں عزیزوں، ہم وطنوں وغیرہ سے ملنا جلنا ان کے کام آنا ان کی عادت تھی۔ خاندان میں لوگ ان کو بے حد چاہتے اور احترام کرتے تھے۔ اور خاندان کے

جھگڑے، قصے نپٹانے اور مسئلوں کو حل کرنے میں اُن سے مدد اور مشورہ لیتے رہتے تھے۔

انتقال سے ایک سال پہلے ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ دماغ پر کچھ فالج کا سا اثر ہوگیا تھا۔ باتیں سن لیتے تھے۔ سمجھ لیتے تھے مگر بول نہ سکتے تھے۔ آخر ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو علم اور ادب شرافت اور انسانیت کا چراغ بجھ گیا۔ پانی پت میں مشہور صوفی درویش حضرت بو علی شاہ قلندر صاحب کی درگاہ میں خواجہ الطاف حسین حالی کا مزار ہے۔

حالی نے ایک شعر غالب کے لیے کہا تھا سچ تو یہ ہے کہ وہ خود حالی کی پوری زندگی کی تصویر پیش کرتا ہے۔

مظہرِ شانِ حُسنِ فطرت تھا
معنیِ لفظِ آدمیت تھا

اس کا مطلب ہے " وہ خدا کی بنائی اس دنیا میں فطرت کے حسن کا ایک نمونہ تھا۔ ایسا نمونہ جو آدمیت کے اصلی معنی دنیا کو بتاتا ہے "

کتابیات

نمبر شمار	نام مصنف	نام کتاب	سنہ اشاعت و پریس
۱	الطاف حسین حالی	دیوانِ حالی	سنہ ۱۸۹۳ء - نامی پریس کانپور
۲	الطاف حسین حالی	مُ نب حالی	مرتبہ شیخ اسمٰعیل پانی پتی - اردو اکیڈمی سندھ
۳	الطاف حسین حالی	کلیاتِ نثر حالی	تاج کمپنی لمیٹڈ - لاہور -
۴	الطاف حسین حالی	مسدس حار	″ ″
۵	الطاف حسین حالی	مجالس النسار دور دوم -	سنہ ۱۹۲۴ء - حالی پریس پانی پت
۶	شیخ اسمٰعیل پانی پتی	کلیاتِ حالی جلد اول	مجلس ترقی ادب لاہور سنہ ۱۹۶۷ء
۷	شیخ اسمٰعیل پانی پتی	کلیاتِ حالی حصہ دوم	مجلسِ ترقی ادب لاہور سنہ ۱۹۶۸ء
۸	صالحہ عابد حسین	یادگارِ حالی	انجمن ترقی اردو ہند چوتھا اڈیشن سنہ ۱۹۷۵ء
۹	صالحہ عابد حسین	الطاف حسین حالی	نیشنل بک ٹرسٹ - سنہ ۱۹۷۹ء

مزید مطالعہ کے لیے کتابیں

۱ مرثیہ غالب —— الطاف حسین حالی

۲ چپ کی داد - الطاف حسین حالی

۳ مسدس حالی ...... الطاف حسین حالی

۴ مناظرہ رحم و انصاف —— الطاف حسین حالی

۵ الطاف حسین

الطاف حسین حالی اردو کے اچھے شاعر، سوانح نگار اور پہلے نقاد تھے۔ وہ مرزا غالب کے شاگرد تھے اور سرسید کے رفقا میں شامل تھے۔ انھوں نے مسدس حالی اور مناجات بیوہ جیسی نظمیں لکھیں جو آج بھی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ مسدس حالی کا شمار تو آج بھی اردو کی نمائندہ ترین نعتیہ نظموں میں ہوتا ہے۔ حالی نے مرزا غالب، شیخ سعدی اور سرسید کی بایوگرافی بھی لکھی۔ یہ بھی اردو کی مقبول ترین کتابیں ہیں اور انھوں نے مقدمہ شعر وشاعری لکھ کر باضابطہ اردو تنقید کا آغاز بھی کیا۔ حالی اچھے شاعر وادیب بھی تھے اور نیک انسان بھی۔ ان کی شخصیت اور کارناموں سے بچوں کو واقف کرانے کے لیے صالحہ عابد حسین نے یہ کتاب لکھی ہے جس میں کوشش کی گئی ہے کہ عام فہم زبان میں حالی کی حیات اور کارناموں پر روشنی ڈالی جائے۔ صالحہ عابد حسین اردو کی معروف ادیبہ تھیں اور خانوادۂ حالی سے بھی ان کا تعلق تھا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

ISBN: 978-93-5160-114-2
9 789351 601142
NCPUL
New Delhi
₹ 20/-